یادگار حسین، نوازندہ.....

سازِ حریت

۱۳۶۱ھ کی اہم ترین انقلابی تصنیف

حسینؑ!

اس سے بڑھ کر اور کیا دنیا میں ہوگا انقلاب
موت کو تو نے حیاتِ جاودانی کر دیا

از
جناب نسیم امروہوی

یادگارِ حسین، نوازندہٗ....

سازِ حریت

مصنفہٗ

شاعرِ آلِ محمد جناب نسیم صاحب امروہوی

نبیرۂ فرزدقِ ہند حضرتِ شمیم مرحوم اعلی اللہ مقامہٗ

مع مقدمہ انگریزی

ازجناب پنڈت برجناتھ صاحب شرغا ایڈوکیٹ

و مقدمہ اُردو

ازجناب ممتاز احمد صاحب ایم، اے

ملنے کا پتہ

ادبستان

گوئن روڈ۔ امین آباد۔ لکھنؤ

ناشرین

ایس پی سریواستوا، ایم اے
ایف جے لوئس، بی اے ایل ایل بی
یو ایس ورما، اوورسیر
جی پی رستوگی، صدر ایچ پی ٹرسٹ لکھنؤ
بی این سنگھ، ایم اے
آر این سالومن، ایم اے

عبداللطیف، دبیر کامل
منیر حسن، دبیر کامل
حامد حسین رضوی، دبیر کامل
ولی محمد، زمیندار امیٹھی۔
تصدق حسین فاضل، دبیر کامل و فاضل
ڈی آر اگروال، بی ایس سی

نقد و نظر

ہمارا اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ اب زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ مرثیہ نے بھی ایک انقلابی کروٹ لی ہے۔ اگرچہ ہمارے مرثیہ گویوں کے یہ رجحانات ابھی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہیں مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا مستقبل شاندار اور ہمہ گیر نہیں۔ مرثیہ زیر نظر اسی شاندار مستقبل کے پرکیف خواب کی پہلی وجد انگیز تعبیر ہے جو شاعر آل محمد جناب نسیم کا ایک علمی و ادبی کارنامہ اور ۱۳۶۲ھ کی ایک انقلابی یادگار ہے۔ یہ مرثیہ نہ صرف اُن محدود شخصیتوں کے لئے شمع محفل ہے جو حسین کو محض اپنا دینی پیشوا سمجھتے ہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہمدردی اور رواداری کا ایک دلچسپ سبق، تمدن و تعاون کا ایک گہرا نشتر، مواسات و محبت کی ایک تیکھی چتون، محاسن اخلاق کا ایک رنگین مرقع، اقتصادی اور معاشی مشکلات کا ایک برمحل حل، ذہنی انقلاب کا ایک زود اثر محرک، ارتقائے بشریت کا ایک عالمگیر پیام اور صلاح و فلاح دنیا و آخرت کا ایک زریں صحیفہ ہے، جو زبان و بیان کی فصاحت و بلاغت اور خوبی و محبوبی کے دوش بدوش، علم و ادب و فلسفہ کے ان دقیق نکات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جن کے علم و جہل سے دنیا میں، قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم اس مرثیہ کے میدان میں ایک ناقدانہ قدم اٹھائیں، مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے آئینے میں مرثیہ گوئی کے ماضی کو بھی ایک نظر دیکھتے چلیں تاکہ ہم اس کی تدریجی ترقیوں کے زینے طے کرنے کے بعد سلسلہ بسلسلہ اس نقطۂ اوج تک پہونچیں، جہاں سے اس کے تمام نشیب و فراز آسانی سے نظر آسکتے ہیں۔

اردو کا پہلا قدم اور ادب اردو میں مرثیے کا مقام یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ اردو نظم و نثر کی ابتدا فن مرثیہ گوئی اور شہدائے کربلا کے منثور و منظوم تذکروں سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں دکن کی اسلامی ریاستوں (بیجاپور اور گولکنڈہ) نے جو مفید

خدمات انجام دی ہیں، انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان علم دوست اور ترقی پسند ریاستوں نے، نہ صرف یہ کہ ہندوستان کی قومی زبان — اردوئے معلی — کی ابتدائی ترقی اور نشر و اشاعت کا سنگ بنیاد رکھا، بلکہ ادب اردو کو فن مرثیہ گوئی سے روشناس کرا کے، ہندوستان کی اس نئی بولی کو جو عربی، فارسی، برج بھاشا اور دیگر ہندی زبانوں کے باہمی اختلاط اور آمیزش کا ایک دلکش نتیجہ تھی، ہندوستانی عوام کے لئے ایک جاذب قلوب چیز بنا دیا، کیونکہ ہندوستان کے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں میں کون ایسا ہوگا جو شہدائے کربلا کی انسانیت نواز قربانی اور ایثار سے ہمدردی اور دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ حق یہ ہے کہ یہاں کے نرم دل اور فطرۃً غمخوار لوگ، کربلا کی خونیں داستان، ان کی اپنی بولی میں سننے کے خواہشمند رہتے تھے تاکہ تاریخِ بشریت کی تکمیل کے اس عظیم الشان سانحے کی جزئیات کی یاد تازہ ہوتی رہے۔

ہماری زبان کے بہت کم تذکرہ نگاروں نے مسئلہ کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ فن مرثیہ گوئی سے ادب اردو کو کیا کیا فوائد پہونچے اور ہمارے مرثیہ گویوں نے نادانستہ طور پر ہی سہی، اپنے جذبۂ عقیدت اور مذہبی جوش و خروش سے، اردو لٹریچر کی توسیع و ترقی میں کتنا شاندار اور قیمتی حصہ لیا۔ درحقیقت یہ اردو کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں فن مرثیہ گوئی کا سہارا مل گیا اور دوسری زبانوں نے جو راستے صدیوں کی تگ و دو اور برسہا برس کی دوڑ دھوپ کے بعد طے کیے تھے، وہ اس کمسن بولی نے، وقت کی بہت قلیل مقدار میں طے کر لیے۔ یقیناً موضوع بحث بہت اہم اور دلچسپ ہو جاتا ہے، جب اس حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اردو کی ہردلعزیزی اور مقبولیت میں مرثیہ گوئی اور مرثیہ گویوں نے کیا کیا حصہ لیا ہے۔ مرثیہ کے لغوی معنی کچھ سہی، مگر اصطلاحی طور پر یہ لفظ شہدائے کربلا کے واقعات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کربلا کا واقعہ غالباً نہیں، بلکہ یقیناً دنیا کا سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ حیرت انگیز، سب سے زیادہ عبرت خیز اور سب سے بڑا انقلابی واقعہ ہے۔ یہ حادثہ چند بندگان خدا کی داستان، موت ہونے کے باوجود ایک غیر فانی نوعیت رکھتا ہے۔ آپ دنیا کے کسی گوشہ میں چلے جائیے اور اس

واقعے کی طرف اشارہ کیجیے، آپ دلوں کے دروازے اس کے لئے کشادہ پائیں گے۔
شاید ہی کوئی سنگدل انسان ایسا ہو جو اس واقعہ کی تفصیلات کو سنے اور اپنی آنکھوں کو اشک ریزی سے باز رکھ سکے۔ حسین کی شہادت ایک بین الاقوامی نوعیت رکھتی ہے اور دنیا کا ہر انسان حسین کے حادثہ شہادت سے اپنے کو اسی قدر متاثر پاتا ہے، جتنا انسانی دل کسی بڑے سے بڑے واقعہ غم اور حادثہ ماتم سے اثر پذیر و متالم ہو سکتا ہے۔ اگر سادہ اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بھی —— حسین بیتی —— بیان کی جائے تو سننے والوں کی دنیائے دل میں ایک کہرام مچ جائے گا۔ چہ جائیکہ جب اس خونچکاں داستان کو ادیبانہ نظم و نثر میں ادا کیا جائے، تو انصاف کیجیے، وہ نظم و نثر کس قدر مقبول ہو گی اور پھر اس کی مقبولیت سے ضمنی طور پر ادب و زبان کو کس قدر فائدہ پہونچے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو، دکنی مرثیہ نگاروں کی ادبی کاوشوں اور دماغی کوششوں کی جولانگاہ بنی تو پلک جھپکتے اس نے اپنی ترقی اور توسیع کا ایک وسیع راستہ طے کر لیا۔ اس سے قبل اردو کو، زبان کہنا، علم السنہ کی توہین تھی۔ امیر خسرو کے چند دوہوں اور چند گیتوں اور بعض صوفیائے کرام کے چند ملفوظات و ارشادات کے علاوہ، اردو کے پاس کوئی قیمتی پونجی نہ تھی۔ نہ نظم کا سرمایہ تھا اور نہ نثر کا ذخیرہ۔ وہ صحیح معنی میں ایک بگڑی ہوئی لشکری زبان تھی جو حد سے حد بازاروں، میلوں ٹھیلوں یا ہندو مسلم عوام کے خاص خاص طبقوں میں کاروباری ضروریات کی بنا پر استعمال ہوتی تھی اور بس —— لیکن جب بیجاپور اور گولکنڈہ کے خوش عقیدہ تاجداروں نے اردو کو محسنِ بشریت حسین کی یاد تازہ کرنے کا ذریعہ بنایا تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ زبان جو ابھی تک ایک شاہد بازاری تھی، عروس درباری بن گئی۔ دکنی اردو میں جو مرثیے کہے گئے انھیں سیکڑوں نے کہا ہزاروں نے سنا اور لاکھوں کو سنایا اور اس زور و شور سے علم و ادب کا یہ نقارہ بجا کہ تمام ہندوستان گونج اٹھا۔ درباروں میں اس نے سکہ بٹھایا، مجلسوں میں اس نے رنگ جمایا، عوام نے اس کو اپنایا اور خواص نے اس کو منہ لگایا۔ عورت، مرد، بچے، جوان، بوڑھے، بادشاہ، فقیر، ہندو، مسلمان، غرض ہر طبقے ہر جماعت اور ہر گروہ نے اس نئی بولی سے لطف اٹھایا۔
گو کہ وجہی دکنی کو ہماری اس زبان کا سب سے پہلا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے اور

ہمیں اس میں شبہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن اگر یوں کہا جائے کہ ولی اردو غزل کا سب سے پہلا باضابطہ شاعر تھا تو حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا، کیونکہ نصرتی اور ہاشمی وغیرہ جن کی تصانیف مرثیوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں، ولی کے بالمقابل اولیت کا درجہ رکھتے ہیں اور اردو شاعری کے تذکرے میں خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ علی عادل شاہ کے عہد میں صرف مرثیے کہے جاتے تھے۔ خود محمد علی قطب شاہ نے دکنی اردو میں متعدد مراثی کہے ہیں۔ ابوالحسن تانا شاہ کا عہد حکومت بھی مرثیہ کی ترقی وتوسیع کا خاص زمانہ تھا۔ تانا شاہ نے خود بھی اس صنف سخن میں اپنی خداداد ذہانت کے جوہر دکھائے ہیں۔ اسی عہد میں شاہ قلی خاں شاہی بہت اچھے مرثیہ گو تھے۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ اگر مرثیہ گویوں کی توجہ اردو کی طرف مبذول نہ ہوتی تو اس پودے کے پھولنے پھلنے اور ترقی کرنے کی قدرتی صلاحیتوں میں تو شک نہیں کیا جاسکتا، مگر اس قدر جلد نشوونما نہ ہوتی۔ مرثیہ گویوں نے اردو کو اپنے ہاتھوں میں لیکر زن و مرد، صغیر و کبیر اور خادم و مخدوم کے سچے اور فطری جذبات نظم کیے اور اس طرح اردو کو عوام کی چیز بنادیا۔ لاکھوں آدمی اس زبان کو جاننے پہچاننے اور بولنے لگے۔ انسانی احساسات و جذبات اگر اشاروں میں بھی ادا کیے جائیں تو قیامت برپا کردیتے ہیں، لیکن جب وہ منظم طریقے پر نظم و نثر کے روپ میں پیش ہوتے ہیں تو ان جذبات کی تاثیر اس نظم و نثر کو بھی غیر معمولی حد تک موثر اور طاقتور بنادیتی ہے۔ یہ ہے اردو کا پہلا قدم ——— اور مرثیہ کا پہلا دور ———

مرثیہ کا دوسرا دور جب مرثیہ گویوں کی محنت اور واقعہ کربلا کی عظمت نے اردو کو ایک جاندار زبان کے قالب میں ڈھال دیا اور وہ اس قابل ہوگئی کہ اہل مذاق کی شوقین طبیعتیں اس میں اپنی موزونیت طبع کے گل کھلا سکیں اور قدرتی اپج کے جوہر دکھا سکیں تو غزل، قصیدہ، رباعی اور مثنوی کا آغاز ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دکن کی سیاسی اہمیت ختم ہوچکی تھی اور سیاست کے پہلو بہ پہلو ادب و تمدن کا مرکز ثقل، دہلی کا شہر قرار پاگیا تھا۔ دکن کی اردو فقط مرثیہ کہتی تھی اور روتی تھی لیکن دلی کی اردو غزلیں کہکر سر دھننے لگی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اردو کے ابتدائی دور میں تو ایک مرثیہ گو ہی سب کچھ تھا، مگر

اس دور میں یہ مثل مشہور ہوئی کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" اس کی وجہ جو کچھ بھی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ شمالی ہند میں مرثیہ کو وہ قدر و منزلت حاصل نہ ہوئی جو بیجاپور اور حیدرآباد میں تھی۔ تھوڑے عرصہ کے لئے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اردو مرثیہ، جس کی ابتدا اس آب و تاب اور دھوم دھام سے ہوئی تھی، اپنے کمال کے جملہ مراحل طے کر کے "ہر کمالے را زوال" کا مصداق بن چکا، مگر یہ دیکھ کر ہم کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اس کساد بازاری کے باوجود کلیۃً جمود نہیں رہا خود وؔلی نے بھی ایک مثنوی میں واقعات کربلا نہایت دردناک اور موثر لہجے میں نظم کیے ہیں۔ سوداؔ، میر تقیؔ، قائمؔ چاندپوری اور اس طبقہ کے قریب قریب تمام اساتذہ نے مرثیے کہے ہیں سوداؔ نے جو مرثیے (مربع و مسدس) کہے ہیں وہ اب تک مشہور ہیں۔ سوداؔ سے کچھ پہلے میاں مسکینؔ مشہور مرثیہ گو گزرے ہیں، جن کا ذکر سوداؔ نے بھی ان لفظوں میں کیا ہے ؎

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکینؔ کہاں ہیں

اس شعر میں سوداؔ کے انداز بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسکینؔ کی تصنیفات کو دیگر معاصرین کے بالمقابل اس صنف میں خاص قسم کا ادبیانہ امتیاز حاصل تھا۔ ان حقائق کو جاننے کے بعد ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس دور میں مرثیہ کی طرف شعرا نے توجہ نہیں کی مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرثیہ گوئی سے ان حضرات کا مقصد اپنے کمالات فن کا اظہار نہ تھا بلکہ محض ثواب اخروی اور سعادت عقبیٰ کے حصول کی خاطر وہ مرثیہ کہتے تھے۔ نہ وہ خود ہی اپنے مرثیے کو کوئی ادبی کارنامہ سمجھتے تھے اور نہ عوام ہی سے اس کی توقع رکھتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس زمانے میں مرثیہ گوئی کا جو رنگ تھا وہ ہرگز اس قابل نہ تھا کہ اس کو کوئی شاعر اپنے لیے سرمایہ ناز سمجھتا۔ اس عہد میں اکثر مراثی چار چار مصرعوں پر مشتمل ہوتے تھے، جن میں واقعہ شہادت بغیر کسی تکلف اور کوشش کے بیان کر دیا جاتا تھا۔ منشا صرف رونا رلانا تھا، اپنی معجز نگاری اور فن کاری کے سکے بٹھانا نہ تھا۔ بطور مثال اس زمانے کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

شہ نے بعد از نوافل و رکعات
تبھی اوپر پھرایا جلدی ہات

دل پکارا۔ رہی ہے تھوڑی رات　　　　کھا آنکھوں نے ٹک تو سوئے حسین

اس تحت کبھی کبھی مسدس بھی کہے جاتے تھے مگر شاعری اور فن کے اعتبار سے ان میں بھی کوئی قابل ذکر خوبی نہیں ہے۔ محض واقعات کا سیدھا سادہ بیان ہے اور بس ——

—— اس زمانے میں فن مرثیہ بحیثیت مجموعی جس عالم میں تھا، اس کا بیان کرنا ہماری غرض وغایت نہیں، دکھانا صرف یہ ہے کہ جس صنف سخن (مرثیہ) نے ابتدا میں اس قدر حیرت انگیز ترقی کی تھی کہ ایک نئی زبان کو وجود میں لانے کا سبب بن گئی تھی، وہ ماحول کی ناسازگاری کی بنا پر اپنی زندگی کے دوسرے دور میں کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکی۔ ترقی تو در کنار، پرانی ساکھ بھی باقی نہ رکھ سکی۔

مرثیہ کا تیسرا دور لیکن آہستہ آہستہ اردو ادب کی یہ اہم اور عظیم الشان صنف، ایک شاندار مستقبل کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ اردو مرثیہ گوئی کے تیسرے دور کا آغاز ۱۲۴۰ھ سے ہوتا ہے، جبکہ میر مظفر حسین ضمیرؔ نے سب سے پہلی مرتبہ مرثیہ کا قصر عالیشان موجودہ بنیادوں پر قائم کر کے آراستہ کیا۔ انھوں نے مرثیہ میں بہار، رجز، منظر نگاری، تشبیب، رزم، بزم اور سراپا وغیرہ کے مضامین داخل کیے اور دفعۃً مرثیہ گوئی کی دنیا میں انقلاب آگیا۔ ضمیرؔ جدید فن مرثیہ کا باوا آدم ہے۔ یہ میر ضمیر ہی تھے جنھوں نے مرثیہ کی دنیا میں ہزاروں نئے راستوں اور جدید اسلوبوں کا اضافہ کر کے انیسؔ و دبیرؔ کے فنی کمالات کے لیے زمین ہموار کر دی۔ وہ مرثیہ گویوں کے طبقہ اوسط سے تعلق رکھتے ہیں ان کے ہمعصر مرزا فصیحؔ، شاہ دلگیرؔ، میر حسنؔ وغیرہ بھی مرثیہ کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ انیسؔ و دبیرؔ کا نمبر ان کے بعد آتا ہے۔ میر ضمیرؔ نے مرثیہ کی جس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

دس میں کہوں، سو میں کہوں یہ وِرد ہے میرا
اس رنگ میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

وہ عالیشان عمارت انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے میں ثریا تک پہونچ گئی۔ میر ضمیرؔ نے اپنی جدت طبع سے دنیائے مرثیہ میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا، اس نے ہزاروں موزوں اور ندرت پسند طبائع کو اپنی طرف کھینچ لیا اور رفتہ رفتہ مرثیے نے اصول نظم، تازگیِ

خیالات اور وسعت ادا کے لحاظ سے اتنی ترقی کی کہ اگر دنیا کی تمام جدید و قدیم زبانوں کے نئے اور پرانے مرثیے ایک پلہ میں رکھ دیے جائیں اور دوسرے پلے میں اردو مرثیے ــــ تو صرف کمیت (مقدار) کے اعتبار سے نہیں بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی اردو مرثیہ ہی کا پلہ جھکا رہے گا۔ اس زمانے میں جن جن مضامین نے مرثیہ کے دامن میں جگہ پائی، وہ بحیثیت مجموعی دنیا کی کسی زبان کی کسی صنف نظم میں بھی بیک وقت سمائے ہوئے نظر نہیں آتے۔ ہمارے مرثیوں کی دنیا پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو ان میں آپ کو تصوف، تغزل، مدح، ہجو، تمدن، معاشرت، اخلاق، واقعہ نگاری، مصوری، جذبات، احساسات اور محاکات و تخیل کی بے شمار تصویریں چلتی پھرتی دکھائی دینگی۔ پھر لطف یہ ہے کہ ان تصویروں میں آپ جس کو بھی دیکھیں گے اس کا ایک ایک خال و خط نمایاں اور روشن نظر آئے گا۔ یعنی اگر صبح کا منظر ہے تو آسمان پر تاروں کا جھلملانا، شمع محفل کی روشنی کا مدھم پڑ جانا، شفق کا پھولنا، نسیم سحر کے جھونکوں کا دھیمی دھیمی چال چلنا، ذرے ذرے میں زندگی اور حرکت کے آثار نمودار ہونا، چڑیوں کا چہچہانا، کلیوں کا مسکرانا، مشرق سے شاہ خاوری کا طلوع ہونا، بار آور درختوں پر شعاعوں کا تھرتھرانا، شبنم کے قطروں کا جگمگانا، انسانوں کا خواب سے آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہونا وغیرہ وغیرہ سب کچھ ہوگا ــــ اسی طرح دوپہر کی گرمی اور اس گرمی سے گھبرا کر پسینے کی اشک ریزی، سہانی شاموں کی کیف انگیزی، اندھیری راتوں کی بلاخیزی، اور پھر ان کے بے شمار جزئیات کی عکاسی ہوگی ــــ رزم کے میدانوں میں فوجوں کی ترتیب، سرداران لشکر کی تنظیم، سپاہیوں کی مورچہ بندی، نیزوں کی چمک، کمانوں کی کڑک، گھوڑوں کی ٹاپوں کی دھمک، سورماؤں کی گاذوری، پہلوانوں کی مبارز طلبی، علمداران لشکر کی صف بندی، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، حریفوں کی رجز خوانیاں، جنگ کے داؤں پیچ اور فنون حرب و کمالات ضرب کا اظہار اور موضوع تیغزنی کا ہر چھوٹا اور بڑا خط نظر آئے گا ــــ اس سلسلے میں حسینی غازیوں کی غیر فانی شہادت اور بے مثال جانبازی و سرفروشی، عالم بیوارثی میں عورتوں کا صبر و شکر، مصیبتوں کے ہجوم میں بچوں کی سنجیدگی، تلواروں کے جھرمٹ

میں جوانوں کا استقلال، تیروں کی بارش میں، بوڑھوں کا ثبات عزم وغیرہ —— ماں بھری ماں، ارمان بھرے جوان بیٹے، دولہا سے بچھڑی ہوئی نئی نویلی دلھن، صابر وغیور بہن، شفیق باپ، وفادار بھائی، تشنہ لب بھتیجی، خیر خوار مجاہد، صادق الارادہ دوستوں اور انصار کے جذبات و تاثرات کا بیان —— اور پھر تاثرات کے بیان میں حفظ مراتب کا خیال اور کردار نگاری کے اصول کی پابندی —— صبر و شکر استقلال، استقامت رضائے حق پر ثابت قدمی، ظلم کی بیخ کنی میں جان دے دینے کے عہد و پیمان، ایثار، شجاعت، حلم، صداقت، جفاکشی، تحمل غرض بیشمار خصائل انسانی کے جیتے جاگتے مرقع —— ساتھ ہی اعلیٰ درجہ کی شاعری، مضمون آفرینی سلاست، حسن ادا، چستی بندش، صداقت احساس، لطافت اظہار اور فن کاری —— یہ ہے مرثیہ کے اہمات مضامین کا ایک غیر مکمل اور ناقص خاکہ، جو میر انیس اور مرزا دبیر کے زمانے میں بنا اور جس نے اردو ادب کی دنیا کو اعلیٰ درجہ کی محاکاتی اور تخیلی شاعری کے ایسے ایسے جواہر پاروں سے بھر دیا، جن کی مثال کسی عہد اور کسی زبان کا لٹریچر اپنے ہر قسم کے چھوٹے اور بڑے، کھوٹے اور کھرے ہیرے اور ریوتھ یکجا کر کے بھی نہیں پیش کر سکتا۔

مرثیہ گوئی اور موجودہ ضروریات فن مرثیہ گوئی کے ہر دور پر مفصل تبصرہ مقصود نہیں ہے بلکہ مرثیہ کے مختلف ادوار اور ان کے رجحانات کا ایک اجمالی جائزہ لے کر زیر نظر مرثیہ کے امتیازی پہلو کو نمایاں کرنا مد نظر ہے۔ مرثیہ کا پہلا دور وہ تھا، جب وہ کربلا کے دردناک واقعات کا محض ایک روکھا، پھیکا مگر سادہ و دلکش بیان ہوتا تھا۔ دوسرے دور میں اگرچہ زبان کچھ نکھر گئی تھی مگر پھر بھی ایک مرثیہ گو بگڑا شاعر کہلاتا تھا اور اب بھی اس کے مضامین کا دائرہ محدود تھا۔ البتہ تیسرے دور میں یہ فن آخری نقطۂ کمال تک پہونچ گیا اور اس صنف نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ تمام اصناف سخن اس کے سامنے گرد ہو کر رہ گئیں۔ یہ کمال انیس و دبیر پر ختم ہو گیا۔ ان کے بعد ابھی تک مرثیہ گوئی کا فن ان حدود سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے جو ان بزرگوں نے مقرر کر دی تھیں۔ مرثیہ کی اس جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود ہم ڈنکے کی چوٹ یہ کہنے کا

حق رکھتے ہیں کہ اگرچہ یہ صنف علم و اخلاق کا بہترین اور اعلیٰ ترین مجموعہ ہے مگر عمرانیات اور معاشیات کے اصلاحی مضامین سے اس کا خزانہ ابھی تک خالی ہے۔ درحقیقت ہمارے مرثیہ گویوں نے اب تک اس فن شریف سے وہ کام ہی نہیں لیا جس کی تکمیل کے لئے یہ قدرتی اور فطری تحریک سے عالم ظہور میں آیا تھا یعنی انسان کامل احسین شہیدا کی سیرۃ حسنہ اور اسوۂ مبارکہ کی تبلیغ اور قومی زندگی کی اصلاح و فلاح ــــ مرثیہ تبلیغ و اشاعت کے لامحدود امکانات اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ کاش ان سے قومی ترقی کا کام لیا جاتا اور حسین کے انقلابی مشن کو دنیا سے روشناس کرایا جاسکتا ــــ بہت کم حضرات ہیں جنھوں نے مرثیہ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے حسینیت ایک ایسی انقلابی تحریک ہے جو سلطنتوں کے دباؤ اور شہنشاہیتوں کے فشار سے زندہ اور پائندہ ہو کر نکلی۔ جس نے تیرہ سو برس سے حریت اور انسانی مجد و شرف کی نورانی شمع کو روشن رکھا جس نے انسان کو سچائی پر مرمٹنے اور حقیقت پر کٹ جانے کی تعلیم دی۔ جس نے یزید کے سامراج کو چکنا چور کر دیا اور جو آج بھی آزادی اور انسانیت کی ایسی بے پناہ پکار ہے جو سوتی ہوئی قوموں کو جگا سکتی ہے اور اونگھتی ہوئی انسانیت کو بیدار کر سکتی ہے۔ حسین کے مرثیہ گویوں اور حسینیت کے تذکرہ نگاروں کا فرض ہے کہ وہ اس انقلابی تحریک کو اس کے حقیقی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتلائیں کہ اس بدحالی اور تاریکی کے دور میں حسین کی شہادت، روشنی کا وہ ہمیشہ جگمگانے والا مینار ہے، جسے طوفان حوادث کا کوئی جھونکا گرا سکتا ہے نہ بجھا سکتا ہے اور نہ اسے رہنمائی سے باز رکھ سکتا ہے۔ ہم فقط جسمانی حیثیت سے ہی نہیں، ذہنی اور دماغی اعتبار سے بھی غلام بن چکے ہیں۔ مغرب کی مادی اور مشینی تہذیب، جو اقبال کے لفظوں میں اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کر رہی ہے، ہم پر چھا چکی ہے۔ ہم اپنی روح کو گنوا چکے ہیں۔ اپنی قومی سیرت کو ضایع کر چکے ہیں۔ ہماری تاریخی خصائص، ہماری دیرینہ روایات، ہمارا نہ مٹنے والا عزم، ہمارا نہ فنا ہونیوالا جذبہ، غرض وہ سب کچھ جو ہماری کامیابی کی ضمانت تھا، آج ہمارے پاس سے نکل چکا ہے۔ کیا ہمارے مرثیہ گویوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ حسینی سیاست کے اسرار دنیا کو سکھائیں اور معاشی ترقی کے وہ گر اور معاشرت کے وہ راز عالم پر منکشف کریں جو حسین کو رسول نے اپنی گود میں لوریاں دے دے کر سکھائے تھے۔ جن تباہ کن رسوم کا ہم شکار ہیں ان پر سرزنش کریں، اسلامی اخوت اور عالمگیر رواداری کا جو نمونہ رسول و اصحاب رسول و اولاد رسول نے پیش کیا تھا اس سے ہم کو باخبر و آگاہ کر کے اس پر گامزن ہونیکی اسی موثر لہجے میں تلقین

کریں جو قومی تعمیر کے ضامن یعنی شاعر کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔

بیشک دس ہزار واعظ اور دس لاکھ خطیب وہ کام انجام نہیں دے سکتے، جو ایک ترقی پسند مرثیہ گو انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس فسوں کا جادو ہے اور نظم کی کرامت ہے۔ شاعر بشرطیکہ وہ متشاعر نہ ہو، ہمیشہ انقلاب پسند اور رجعت دشمن ہوتا ہے پھر اگر کسی سچے شاعر کی انقلابی روح، حسینؑ کی انقلابی تحریک سے ہم آہنگ ہو کر میدان عمل میں آجائے تو انصاف کیجیے، کہ کونسی طاقت، قومی زندگی کے انقلاب کو دبا سکتی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ حسینؑ کو بحیثیت ایک دینی پیشوا کے پیش کرنے والے، کبھی اس کی کوشش نہیں کرتے کہ اس انسان کامل کو بحیثیت ایک انسان کے پیش کریں۔ جس کی محض انسانیت ہی بجائے خود اس درجہ کامل و برتر ہے کہ پھر اسے کسی دوسرے وصف کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دور حاضر کا مرثیہ گو عصر حاضر کا مرثیہ گو وہی ہے جو حسینؑ کو بہ حیثیت انسان، ہمارے سامنے پیش کرے اور جس کا زاویۂ نگاہ مرثیہ گوئی سے وہی ہو جو ابھی چند سطور میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ بات کچھ کم اطمینان بخش نہیں ہے کہ کم سے کم ایک مرثیہ گو ہماری قوم میں ایسا موجود ہے جو مذکورۂ بالا معیار پر پورا اترا ہے۔ ہمارا اشارہ شاعر آل محمد جناب نسیم کی طرف ہے۔ اس وقت جو مرثیہ ہمارے سامنے ہے وہ مرثیہ گوئی کی دنیا میں ایک نئے انقلاب کا علمبردار ہے جی چاہتا ہے کہ اس مرثیہ کے بعض انقلابی پہلوؤں کو اس ضمن میں پیش کیا جائے، مگر کیا بہتر نہ ہوگا کہ تصنیف سے پہلے مصنف سے اپنا تعارف مکمل کر لیا جائے کہ شعر کے مقابل شاعر کو سمجھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے اور شاعر کے سمجھنے ہی پر اس کے شعر کا سمجھنا موقوف ہے۔

نسیم کے ادبی رجحانات جناب نسیم کا تعلق (سرزمین شعر و سخن[۱]) امروہہ کے ایک مشہور و معروف خانوادۂ علم و ادب سے ہے، جس کے بزرگ آج سے کئی سو برس پہلے سرزمین زید پور سے ترک سکونت کر کے یہاں چلے آئے تھے۔ جناب نجم الملۃ مرحوم اعلی اللہ مقامہ بھی اسی خاندان دانش و بینش کی اہم ترین فرد تھے۔ شاید ہی اردو مراثی سے دلچسپی رکھنے والا کوئی شخص، فرزدق ہند حضرت شمیم مرحوم اعلی اللہ مقامہ کے نام نامی سے ناواقف و بے خبر ہو۔ افسوس یہ ہے کہ مرحوم کا

---

[۱] جناب محشر لکھنوی کے لفظوں میں سے

امروہہ درحقیقت ایمان شاعری ہے
مولد ہے مصحفی کا محشر ذرا سنبھل کر

مجموعۂ سخن (سوائے بیس پچیس مراثی کے) ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔ ورنہ دنیا دیکھتی کہ انیس و دبیر کی بزم سخن دوسرے صاحبان کمال کے وجود گرامی سے بھی خالی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شمیم مرحوم کے مرثیے، زور بیان، حسن ادا، جدت خیالات، ندرت تشبیہات و استعارات و نیز محاسن لفظی و معنوی اور سب سے بڑھکر "مرثیت" کے اعتبار سے کسی باکمال مرثیہ نگار کے شاہکار سے کم نہیں۔ شمیم کی طبیعت ایک سدا بہار گلشن تھی، جس میں شعر و سخن اور علم و ادب کے ہزاروں پھول کھلتے رہتے تھے اور اس کلیہ کے مصداق تھے کہ ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ وہ فن شعر کی ہر صنف میں استادانہ مہارت رکھتے تھے اور یہ ان کی طبیعت کی بوقلمونی اور رنگا رنگی کا ثبوت تھا۔ کوئی صنف سخن ایسی نہیں ہے، جس میں مرحوم نے اپنے کلام و کمال کا ذخیرہ نہ چھوڑا ہو۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، واسوخت، چار بیت، ڈراما، ہزل، گیت، ٹھمری، نوحہ، سلام اور مرثیہ غرضکہ شمیم نے ہر میدان میں زور طبع دکھایا ہے اور ہر منزل میں کامیاب ہیں۔ جناب نسیم اسی صاحب کمال استاد کے پوتے اور جانشین ہیں اور وہ بھی بجا طور پر مفتخرانہ انداز سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں — اور ساقی نامہ میں انھوں نے کہا بھی ہے ؎

پانچ پشتوں سے ہوں پھیری میں لگانیوالا : بے بئے ناب پیے اب نہیں جانیوالا

نسیم صاحب کی زندگی اور شاعری، ایک دوسرے کا صحیح پرتو ہیں۔ ان کی شاعری جس قدر انقلاب انگیز ہے، ان کی زندگی اس سے زیادہ انقلاب پسند ہے۔ وہ حد درجہ ملنساری کے باوجود حد درجہ غیور، غیر معمولی سادگی کے باوجود غیر معمولی شخصیت کے حامل اور حیرت انگیز روشن خیالی کے باوصف حیرت انگیز عزم و عمل کے مالک ہیں۔ مرثیہ کی دنیا میں ان کا ایک ممتاز و مخصوص درجہ ہے، جو انھوں نے اپنے لئے صرف تقلیداً نہیں، بلکہ اجتہاداً پیدا کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کی غزلیں سنیں تو کہیں کہ یہ شخص صرف غزل کہنے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ قصیدہ پڑھیں تو خیال کریں کہ قصیدہ ہی اس شخص کے قلم کا جولانگاہ ہے۔ نظم میں دستگاہ کامل رکھنے کے ساتھ ان کی نثر بھی شاندار ادبیت و علمیت کا نمونہ ہوتی ہے۔ ان کی تصنیفات بیشمار ہیں، مگر مشاغل بھی لامحدود ہیں۔ درس و تدریس اکتساب معیشت کا وسیلہ ہے جس میں آپ شب و روز مشغول رہتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص اتنی

مصروفیات کے باوجود ادبیات کے مختلف شعبوں میں تکمیل و اجتہاد کا درجہ کیونکر حاصل کر سکتا ہے۔ نسیم صاحب کا اصلی میدان مرثیہ گوئی ہے۔ ان کی خداداد ذہانت نے شعر و سخن کی اس صنف میں فکر رسا کے نایاب گل کھلائے ہیں ـــــ لیکن جہاں تک لطیف تغزل کا تعلق ہے بلاشبہ اگر جناب نسیم صرف غزل ہی کو اپنا لیتے، تو اس میدان کے مرد اور اس وادی کے شہسوار نظر آتے۔ اس سلسلے میں موصوف کی قدیم غزلیات کے چند شعر بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں جو جناب زخمی صاحب لکھنوی کے ایک مضمون "نسیم کا بچپن اور لڑکپن" (مطبوعہ کتاب ادبستان و اخبار حق دسمبر ۳۶ء) سے ہم نے اقتباس کیے ہیں۔ نسیم صاحب نے سنہ ۱۹۲۰ء میں جبکہ آپ اپنی عمر کی بارھویں یا تیرھویں منزل میں ہوں گے (اس وقت موصوف کی عمر تیس، بتیس سال ہے) اچھوتی بحر میں ایک غزل کہی تھی۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

لذت موت بھی ہے کیا لذت ۔۔۔ یہ مزہ عمر بھر نہیں آتا

ذرا انصاف کیجیے۔ کیا بارہ تیرہ برس کی عمر میں ایسا لطیف شعر کہنا جو سراسر حقیقت سے لبریز ہے نسیم کی خداداد ذہانت کا معجز نما شاہکار نہیں۔ ذیل میں ہم مختلف سنین کے مختلف اشعار پیش کرتے ہیں جس سے شاعر کی تدریجی ذہنی ترقی کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ "شاعر آل محمد" مشاعروں میں شرکت کو اپنے ممدوح کی شان کے خلاف سمجھتا ہے اور ہمیشہ اس قسم کے ہنگاموں سے دامن کش رہتا ہے۔ یہی فطری استغنا اسے اپنی کلیات غزل کی جمع و ترتیب سے باز رکھتا ہے۔ کاش نسیم صاحب کے احباب ان متفرق جواہر پاروں کو تلف ہو جانے سے بچا سکیں۔ آئیے اب نسیم پر ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے نظر ڈالیں۔

سنہ ۱۹۲۰ء کی دوسری غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

نہ روکو ہاتھ کو خنجر گلے پہ چلنے دو ۔۔۔ ہمارے دل کی تمنا تو کچھ نکلنے دو
بتوں کے عشق سے روکو نہ زاہدو مجھ کو ۔۔۔ خدا کا خوف کرو دل ذرا بہلنے دو
ابھی بر آئے گا مطلب قریب ہے مقتل ۔۔۔ بس آ لیے سر منزل کچھ اور چلنے دو
چکھا دی حضرت واعظ نے تلخیٔ گفتار ۔۔۔ ذرا سی مے سے مجھے ذائقہ بدلنے دو
کہیں ہے رنگ حقیقت کہیں مجازی ہو ۔۔۔ نسیم لطف دکھانے تری غزل نے دو

دیکھیے ان اشعار میں جو پختگی، جو چستی، جو تناسب اور جو لطفِ زبان پایا جاتا ہے وہ بجائے خود کس قدر اہم ہے، اس کے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کے بعد ۲۲ء کے کہے ہوئے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ جن میں شاعر کا ادبی شعور اور نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جو رازِ گریۂ شبنم کی جستجو کرتے
"تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے"

جو ملتی خاک تیمم کو ان کے کوچے کی
گناہگار تھے پھر ہم اگر وضو کرتے

بس اعتبارِ محبت کی حد یہ تھی ورنہ
مجھی سے کیوں مرے مرنے کی گفتگو کرتے

مطلع بیعدیل، لاجواب اور ادبی رنگ لیے ہوئے ہے۔ دوسرے شعر کی بندش اور شوخی بے مثل ہے اور تیسرا نشتر ——— داد نہیں دی جا سکتی بخدا تیسرے شعر کی ——— اعتبارِ محبت کا مضمون اس سے زیادہ دلکش پیرائے میں شاید ہی کہیں بیان کیا گیا ہو۔

۲۳ء کی ایک غزل کے چند شعر سنیے ؎

مرے دل کی کشش سے آپ کیوں آتے بیاباں میں
ذرا آئینہ دیکھو گرد ہے زلفِ پریشاں میں

معاذ اللہ حسن و عشق کے افسانے کی لذت
دیا ہے طول حق نے سورۂ یوسف کو قرآں میں

غزل کا مطلع مومن خاں مرحوم کے طنزیہ رنگ میں ہے اور لاجواب ہے۔ دوسرے شعر میں استدلال کی پختگی تعریف و تحسین سے بالاتر ہے۔

۳۱ء میں شاعر کے تخیلات بہت واضح اور بلند ہو گئے تھے۔ ملاحظہ ہو ؎

کیا جو غور تو سمجھا نہ جانے کیا ہوں میں
نہ کچھ سمجھنے پہ سب کچھ سمجھ گیا ہوں میں

فنا تو ہوں پہ بقا کے لئے فنا ہوں میں
خود اپنے خون کا واللہ خوں بہا ہوں میں

قیودِ وقت و مکاں کو مٹا چکا ہوں میں
تعینات کی حد سے نکل گیا ہوں میں

منا دے خیریتِ آشیاں تو اے صیاد
جلا ہوا ترے دامن کو دیکھتا ہوں میں

میں ہوں قفس میں نشیمن پہ کوندتی ہے برق
خدا دکھاتا ہے جو کچھ وہ دیکھتا ہوں میں

ہائے کیا بیکسی ہے!

گذر رہے ہیں مرے قلب پر مصائب دہر
جو عمر بھر نہ ہوا تھا وہ راستہ ہوں میں

میں مدعی تو نہیں ہوں خدائی کا لیکن — قسم خدا کی، خدائی کا مدعا ہوں میں

چند لفظوں کے ہیر پھیر سے شعر آسمان پر جا پہونچا ہے۔

جو صبح ہو تو بتاؤں میں انتظار کی حد — ابھی تو رات کے تاروں کو گن رہا ہوں میں

طول شب فراق کا شکوہ تقریباً دنیا کی ہر زبان کے ہر شاعر نے کیا ہے مگر یہ مضمون جس طرح نسیم صاحب نے نظم کیا ہے غالباً اس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔

ازل کے دن سے میں ناکام آرزو ہوں نسیم — کچھ ابتدا نہیں جس کی وہ انتہا ہوں میں

یہ غزل اپنے فلسفیانہ تصورات، اپنی لطافت ادا، اپنی پختگی فکر اور استادانہ تکمیل کے اعتبار سے نسیم صاحب کا شاہکار ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت ہمارا شاعر عنفوان شباب کے مراحل طے کر رہا تھا۔ اسی سن کی ایک دوسری غزل سنیے ؎

ہم ہیں وہ برباد جو آئے عدم آباد سے — کچھ بظاہر قید سے ہیں اور کچھ آزاد سے

"بظاہر قید سے" اور "کچھ آزاد سے" کی تعریف نہیں کی جا سکتی!

آشیاں پر گرنے والی برق دم لینا ذرا — کب بہار آئے گی اتنا پوچھ لوں صیاد سے

کیا بیساختگی اور کیا حسرتناک شوخی ہے۔ سبحان اللہ!

سوز غم سے سب اسیروں نے جلا ڈالے قفس — ہائے وہ قیدی جو واقف ہی نہیں فریاد سے

ایک وہ ہیں جن کا دل گھبرائے میرے ذکر پر — ایک میں ہوں دل کو بہلاتا ہوں ان کی یاد سے

بڑا سادہ اور بڑا پر لطف شعر ہے۔

سنہ ۳۲ء میں زبان اور نکھر گئی ہے، شوخیاں اور جوان ہو گئی ہیں اور خیالات اور گہرے ہو گئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہر اک ذرہ میں گل، ہر گل میں دل، ہر دل میں اک دنیا
ہزاروں کارواں منزل بہ منزل دیکھتے جاؤ

"ساحل مجھے" اور "دل مجھے" کی زمین میں فرماتے ہیں ؎

پی کے بہکا بھی تو آیا لب پہ او دل نام دوست — ڈوب کر دریا کی تہ میں مل گیا ساحل مجھے

ہائے کیا عذر مستی ہے۔ دوسرے شعر میں فنا اور بقا کی ہم آہنگی اس طرح واضح کرتے ہیں۔ گو کہ یہ ایک فرسودہ مضمون ہے مگر طرز بیان نے جدت اور ندرت پیدا کر دی ہے ؎

آب خنجر میں فنا سے مل گئی حد بقا   ایک ساحل میں نظر آتے ہیں دو ساحل مجھے

تھک کے پڑ رہنا بھی ہے اک حد سعی جستجو   لغزش پا میں نظر آتی ہے اب منزل مجھے

تھک کے پڑ رہنے کی منزل بھی عجیب منزل ہوتی ہے واقعی۔ اس غزل کا چوتھا شعر ملاحظہ ہو۔

دست رہزن سے ہے سالک کی نگہباں راہِ عشق   خاک اڑا کر خود چھپا دیتی ہے ہر منزل مجھے

حسن تعلیل، مضمون آفرینی، خیال بندی اور ساتھ ساتھ رہرو کی ہمت افزائی کی بہترین مثال ہے یہ شعر۔ اس مختصر سے مقالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ نسیم کے رنگ تغزل کو پوری طرح نمایاں کیا جا سکے، مجبوراً اب ہم دوسرے موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ نسیم صاحب نے قدرتی مناظر پر نئے رنگ کی بہترین نظمیں بھی کہی ہیں۔ غالباً ماہنامہ عالمگیر میں آپ کی ایک نظم نظر سے گذری تھی جس کا عنوان "بھاپ" تھا۔ اس کا ایک مطلع اب تک یاد ہے اور شاید ہمیشہ یاد رہے گا۔

بھاپ اے فطرت کے دود دل ادھر بھی اک نظر   دل تڑپ اٹھا تری نازک خرامی دیکھ کر

اس نظم میں اول موصوف نے سمندر سے بھاپ کے اٹھنے اور پہاڑوں سے ٹکرا کر چمنستان فطرت میں رنگ رنگ کے گل بوٹے کھلانے کی اس انداز سے مصوری کی ہے کہ باید و شاید۔ فرماتے ہیں

رنگ بھورا، سر کھلا، اڑتی ہوئی زلف رسا   یہ ترے ہر بال میں پیچیدہ مستانہ ہوا

جیسے مغرب کی کوئی دوشیزہ پی کرے کا جام   ہو سنہرے بال بکھرائے ہوئے مست خرام

اس کے بعد بھاپ کو مخاطب کر کے محاکات و تخیل کے دلکش سنگم کی سیر کرائی ہے ؎

چل مری بستی میں فارغ ہو چکی اشنان سے   واں سکھانا اپنے گیسو شاہدوں کی شان سے

بعد ازاں اس سوال کا جواب بھاپ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے ؎

چشمۂ فطرت کے پانی کی فقط پیاسی ہوں میں   بستیوں سے مجھکو وحشت ہے کہ بن باسی ہوں میں

حسن تعلیل نے حقیقت میں شیر و شکر ہو کر کس قدر مزہ پیدا کر دیا ہے۔ پھر کہتے ہیں ؎

تیری بستی میں بھی رہتی ہوں میں گرم سوز و ساز   لیکن ایسے جیسے تن میں روح ہو یا دل میں راز

میری آہوں کا دھواں ہے جس کا کہرا نام ہے   ہے مرے اشکوں کا دریا جس کا گنگا نام ہے

گر گئے تھے خاک کے دامن پہ جو آنسو مرے   توڑ کر پتھر کا دل چشموں سے وہ بہنے لگے

غرض اس سلسلے میں بھاپ کی تمام فطری اشکال اور انسانی مصنوعات کا ذکر کر کے آخر میں بھاپ کی زبان سے انسان کو یہ اخلاقی سبق دیا ہے ؎

میں ہمیشہ رہتی ہوں خدمت میں تیری گرمجوش ۔۔۔ پر نہیں تیری طرح فطرت مری ظاہر فروش
میرے مذہب میں جتا کر کام کرنا جرم ہے ۔۔۔ نیکیوں کو اپنی طشت از بام کرنا جرم ہے
پھول کب کہتا ہے بوئے مشک و عنبر مجھ میں ہے ۔۔۔ مدعی خود کب ہے آئینہ کہ جوہر مجھ میں ہے
نیکیوں سے اپنی خود انجان بن جا جان کر ۔۔۔ چشم ظاہر کو نہ ہو محسوس یوں احسان کر

غرض اس بحث سے ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ نسیم نے ہمہ گیر طبیعت پائی ہے۔ چنانچہ آپ نے بیشمار قومی نظمیں بھی کہی ہیں۔ جن سے آپ کے سیاسی رجحانات کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خیالات حب الوطنی اور قوم پرستی کی طرف مائل ہیں۔ آغاز جنگ کے بعد آپ کا ایک گیت ماہنامہ ساقی میں شایع ہوا تھا اور شاید کانپور ریڈیو پر بھی گایا گیا تھا۔ جس کی ابتدا ان مصرعوں سے ہوتی ہے ؎

اے بھارت کے ویر سپاہی جلدی ہو تیار
ڈوب رہی ہے تیری نیّا ۔۔۔ بڑھ کر آپ سنبھال کھویا
بیڑا ہوگا پار
اے بھارت کے ویر سپاہی جلدی ہو تیار

یہ ایک سرسری تذکرہ تھا آپ کی جامعیت کا ـــــ مگر آپ کا اصلی میدان مرثیہ ہے۔ آیئے مختصر سے لفظوں میں نسیم صاحب کی مرثیہ گوئی پر ایک نظر ڈالیں اور مرثیہ کی دنیائے فکر میں انھوں نے کیا انقلاب پیدا کیا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کریں ـــــ آپ کو ابتدا ہی سے مرثیہ گوئی کا شوق ہے جیسا کہ آپ نے اپنے ایک قصیدے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

میرے فطری ذوق سے ہیں باخبر افراد قوم ۔۔۔ چھوڑ کر آغوش مادر میں سر منبر گیا

مرثیہ میں آپ ایک مستقل رنگ کے مالک ہیں۔ زبان وہی ہے جو انیس کی ہے اور جس پر خدائے سخن کو ناز تھا۔ نسیم نے قدم قدم پر انیس کا تتبع کیا ہے اور اس بات پر ان کو فخر کرتے ہوئے ہم نے خود سنا ہے مگر نظریہ شعر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ نسیم نے مرثیہ کے امکانات انقلابی کو محسوس کر کے انھیں اپنے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیر نظر مرثیہ اس کامیاب کوشش کا کامیاب ترین نتیجہ ہے۔ نسیم مرثیہ کو قومی اصلاح اور حسین کے انقلابی مشن کی تبلیغ کا آرگن بنانا چاہتے ہیں۔ حسین کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کر کے اس کی شاندار انسانیت کے ہر پہلو کو بے نقاب

کرنا، ان کے فن کا مقصد ہے، قومی معائب پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ سماجی خرابیوں کی بیخ و بن پر اپنے قلم کی بھاری ضرب لگا کر حسینیت اور یزیدیت کا فرق آشکارا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا ہر مرثیہ مستقل پیغام ہے عزم و عمل کا۔ ایک مجموعہ ہے حریت و اجتہاد کا۔ ایک نعرہ ہے بیداری اور زندگی کا۔ وہ کہیں سیاست آل محمد کے راز بتانا چاہتے ہیں اور کہیں معاشرت آل محمد کے اسرار سے دنیا کو واقف کرنا چاہتے ہیں۔ صرف لفظی صنعتگری اور فنی شعبدہ بازی ان کا مقصد نہیں ہے۔ وہ نہ اپنی تشبیب بہار کے لئے طالب واہ ہیں اور نہ بیان مصائب کے لئے خواہشمند آہ۔ وہ واہ اور آہ دونوں سے بلند تر ہیں۔ ان کے مرثیوں کی کامیابی کی دلیل نہ داد و تحسین کی فلک بوس آوازیں ہیں اور نہ اشک و آہ کے دلخراش نعرے، نسیم کی فکر جوان اور مقصد انقلاب انگیز ہے۔ چنانچہ زیر نظر مرثیہ میں فرماتے ہیں ؎

نہ داد دیجیے میرے کلام کی سنیے　　　یہ شاعری نہیں باتیں ہیں کام کی سنیے

جہاں تک فن کا تعلق ہے تو وہ اس صنف میں انیس و دبیر دونوں پیغمبران سخن سے یکساں عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے اپنے لفظوں میں ؎

کسی کی بزم سخن کا نہیں ہیں گو کہ جلیس　　　مگر یہ میرا عقیدہ ہے اور ہے بھی نفیس
نسیم باغ لگائے ہزار کوئی رئیس　　　وہی پھلے گا جو ہو پیرو دبیر و انیس
دبیر کے جو مقلد ہیں زیب مجلس ہیں
انیس سے ہے جنھیں انس سب کے مونس ہیں

انیس کون خدیو سخن خدائے سخن　　　دبیر شاہ سخن خالق بنائے سخن
انھی کے جسم پہ موزوں تھی بس قبائے سخن　　　چراغ دو تھے مگر ایک تھی ضیائے سخن
نشانہ ایک تھا گو مختلف کمانیں تھیں
کہ ذوالفقار کی گویا یہ دو زبانیں تھیں

آپ مرثیے میں واقعات و حقائق نظم کرتے ہیں، تخئیل کی انتہائی بلند پروازی میں بھی واقعیت اور حدیث و قرآن کا دامن نہیں چھوڑتے لکھنؤ نے ان کے کمال کی جی کھول کر داد دی ہے جس مجلس میں نسیم صاحب پڑھتے ہیں، وہ مجلس ارباب کمال و علما کے اجتماع کے لحاظ سے یادگار ہو جاتی ہے۔ یوں تو آپ نے دنیائے مرثیہ میں متعدد شاہکار پیش کیے ہیں مگر بعض مرثیے اپنی زبان

و بیان، اپنے موضوعِ نظم اور اپنی ندرتِ خیال کے اعتبار سے جاودانی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک مرثیہ بنتِ رسول کے حال میں کہا ہے اور ان کی تقریبِ عروسی کو نظم کیا ہے، جس میں اظہارِ حقیقت کی پابندی کے ساتھ قدم قدم پر رسالتمآب کے فقر کا لحاظ رکھا ہے مگر جذبۂ عقیدت کے ماتحت، فقر کے پہلو بہ پہلو اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ شہنشاہِ کونین کی بیٹی کا عقد ایسی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے ہو کہ دنیا میں کوئی دوسرا جشن ایسی شان و شوکت سے نہ ہو سکے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آپ نے اس اجتماعِ ضدین کی منزل کو کیونکر سلامت روی سے طے کر لیا۔ یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس مرثیہ میں کسی جگہ حدیث و قرآن و حقائق کا دامن چھوٹنے نہیں پایا۔ اس مرثیہ کی کامیابی کے سلسلے میں اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ یہ مرثیہ (مجلس میں) اسن کر چشم و چراغِ خاندانِ انیسؔ جناب فرزند حسن صاحب جلیل مدظلہٗ نے جو کہ لکھنؤ کے قدیم مرثیہ گو اور ریختہ کار اساتذہ میں ہیں اور جناب انسؔ مرحوم کے حقیقی جانشین ہیں، ایک قصیدہ کہا، جو اخبار نظارہ میں شائع ہوا تھا اور جس کا مطلع یہ تھا ؎

ذکرِ شادی نظم کیا اچھا کیا اس شاہ کا   جو بنا دولھا نبی کی دخترِ ذیجاہ کا

اب ہم اپنی توجہ پھر زیرِ نظر مرثیہ کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ یہ مرثیہ کلامِ نسیمؔ کے محض امتیازی محاسن ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ تاریخِ مرثیہ گوئی کے ایک نئے دور کا سنگِ بنیاد بھی ہے۔ جس پر قومی تعمیر کی عالیشان عمارت قائم ہوگی یہ فن کاری کی دنیا میں اصلاح کی پہلی برقی لہر ہے جو آنافاناً رگوں میں دوڑ کر مستقبل قریب میں تمدن و حریت کے ان جذبات کو ابھار دے گی جو موجودہ ذہنی اور دماغی تاریکیوں کو دور کرنے کے ضامن ہیں۔ شاعر کے ذوقِ سلیم کی ہمواری پر بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے جب ہماری توجہ ادھر منعطف ہوتی ہے کہ اس مرثیہ میں متاخر نے متقدمین کی تقلید سے سرِ موانحراف نہ کرتے ہوئے ہر جگہ اپنی قوتِ اجتہاد سے کام لیا ہے۔ ہم اس موقع پر تمہید کو طول دیکر زیادہ دیر ناظرین کو نسیم صاحب کے کلام سے محروم رکھنا نہیں چاہتے اس لئے صرف مرثیہ کا خاکہ پیش کر کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں اور بس۔ مصنف نے اس مرثیہ میں بیان کیا ہے کہ حسین کی قربانی نے اسلام کے علاوہ انسانیت کو بھی بیشمار فوائد پہونچائے خانہ جنگی اور امتیازِ آئین و ملت کا متعصبانہ احساس حنفیت کے منافی ہے۔ اخلاقِ حسین، خلقِ رسول کا آئینہ ہے اور اس کا زاویۂ نگاہ ہے مساوات، رواداری اور بنی نوعِ انسان کی

بے لوث خدمت۔ حسینیوں کے فرائض کیا کیا ہیں ہم کسب معیشت سے غفلت برتنے اور رسوم بد کو اختیار کر لینے کے باعث جس بری حالت میں پہونچ گئے ہیں اس کی اصلاح کے بغیر، حسین کی محبت کا دم بھرنا ایک غلط جذبہ ہے صنعت و حرفت اور محنت و مزدوری سے کسبِ معیشت کرنا حسین کا اور ان کے بزرگوں (انبیاء و اولیا) کا شعار تھا اور اسی کی ہم کو بھی تاسّی کرنا چاہیے۔ اس کے بعد شکوہ کے لہجے میں ساقی نامہ شروع کیا ہے جس کے خاتمہ پر نہایت پُر تاثیر اور دلخراش لفظوں میں بزم حسینی کے متوالوں کی سرفروشی اور جانبازی کی طرف اس انداز سے اشارے کیے ہیں جن کو سن کر آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں عقیدتمندوں کی روتے روتے ہچکی بندھ جاتی ہے مگر شجاعت و دلیری کے جذبات افسردہ نہیں ہونے پاتے بلکہ جتنی رقت بڑھتی ہے اتنی ہی عمل کی سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے مضامین سے مرثیہ کا نگارخانہ پہلی دفعہ سجا گیا ہے اور یہ ہمارے مصنف کا نقش اول ہے مگر کتنی دلکشی اور جاذبیت رکھتا ہے اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے پہلے اس کا مطالعہ ضروری ہے لہذا ہم اپنی تمہید کو ختم کرتے ہیں۔ اب آپ شوق سے نسیم صاحب کا مرثیہ پڑھیے۔

❀ INTRODUCTION.

(By P. Brijnath Sharga, Advocate.)

Poetry—God is Beauty; God is love; God is truth. Poetry, in so far as it gives expression to Beauty, Love and Truth, is Divine. Like a Prophet, a Poet—true Poet—manifests Divinity. Logic appeals through reason, Revelation, through Self and Poetry, through emotions; but the goal is the same, to lead man towards Beauty, towards love, towards Truth, in one word, towards Emancipation. Poetry, with which alone I am concerned here, is produced by the vibrations of the strings of the poet's heart; it succeeds by producing sympathetic vibration in others. Sympathetic vibration is possible only between instruments in tune with each other. So far as human heart is concerned environments, to a large extent, attune it. The *mersia* that follows is real poetry, welling up from the poet's heart coloured by environment.

❀ اسباب جو کچھ بھی ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی زبان نے ہمارے سماج اور ادب پر ملکی بولیوں سے بھی زیادہ تسلط جما لیا ہے چنانچہ بالخصوص کیمبرج یونیورسٹی کے سند یافتگان اور "دوسری زبان" کے طور پر اسکولوں میں اردو پڑھنے والے حضرات کو اپنی مادری زبان کا علم و ادب سمجھنے اور سمجھانے میں بہت دشواری پیش آتی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس عظیم الشان انقلابی تصنیف کو مذکورۂ بالا حضرات سے روشناس کرانے کے لئے ایک مقدمہ انگریزی میں بھی شایع کیا جائے۔ ہم اس سلسلے میں جناب شرگا صاحب کے شکرگزار ہیں جنہوں نے ہماری درخواست قبول کر کے علم و ادب پر احسان فرمایا۔

***Marsia* in Arabia**—In the arid desert of Arabia devoid of life, austerity, solemnity and sorrow have a stronger appeal than any other emotion; it is no wonder, therefore, that in Arabia poetry began with dirges; even in pre-Islamic days the art of composing elegies had attained great heights. The elegy of *Mutammim* on the death of his brother at the hands of *Khalid bin Waleed*, brought tears into the eyes even of *Hazrat Omar* who was not of an emotional temperament. Poignant though was the grief on the supreme sacrifice of *Husain*, Arabia could not produce such a touching elegy on this heart-rending tragedy; for poetry had, by that time, degenerated into a slave of the temporal power and *Bani Umaiya* had, by repression, sealed the lips of poets; a few ex-tempore lines on *Imam Zainul Abideen* earned for the poet, *Farazduq*, a solitary cell in the royal jail.

***Marsia* in Persia** —Persia was hardly the country where elegy could flourish; the proverbial splendour of the Persian Court, the artificiality of Persian life and the mercenary spirit of Persian poets combined to create an uncongenial atmosphere for elegy, though, here and there, the emotion of grief was beautifully depicted, for example, by *Firdausi, Saadi* and *Amir Khusro*. It was left to *Mohtashim Kashi*, under inspiration from his master, *Tahmasp*, to strike a new line and

compose a touching elegy on the martyrdom at *Karbala*; but few, if any at all, followed him till we come to *Zuhoori*. *Zuhoori's* elegies do not spring from the depth of his heart; he mourns the death of the *Imam* with kid-gloves on and generally ends by lamenting that the tragedy was perpetrated because his patron, *Ibrahim Adil Shah*, did not then exist. *Debil* and *Muqbil* also tried their pen at elegy with some measure of success.

***Marsia* in Urdu**—The first Urdu poet who wrote on the tragedy of *Karbala* seems to be one Miskeen; *Sauda* also tried his pen at it; but it was left to Lucknow to attain perfection in elegy writing. Before *Zameer* and *Khaleeq*, the father of *Anees*, the sphere of elegy was restricted, in form, to *murabba* and *musaddas* and in substance, to mere lamentation. These two poets widened the scope by introducing the descriptive element in elegy, e. g., the description of the *Imam's* person, of the battle and of similar other topics. I believe with Taine that the introduction of his new element was due to the influence of enviroment. This may or may not be true of *Zameer* and *Khaleeq*, but it, certainly, is true of *Anees* and *Dabeer*.

Effect of Indian temperament on Urdu Poetry- The Indian is, by temperament, full of joy. He

sees exuberence of life around him. Death is but hibernation. The beautiful marigold fades and fails only to make room for *motia* and *bela* which succeed it and in their turn, disappear to let marigold reappear. Before the advent of the British, want was unknown; ours was the land of plenty—*Bharat*, the feeder. Elegy, as such, does not find an important place in ancient Indian Poetry. Born and brought up in this atmosphere, Urdu poetry enriched its Persian patrimony, the *ghazal*, at the expense of the other forms. It became too artificial, too hackneyed, too common place to inspire and elevate. Surfeit of 'wine', the "intoxication" of "meeting the beloved" (*wasl*). with occasional driblets of 'mad ravings' on 'separation' (*hijr*) became the end all and be all of life. As China, at one time, was a nation of opium-eaters, we had become a nation of day-dreamers. Though the intrusion of the foreigner had disturbed the placidity of our life, our day-dreaming had not ceased.

Influence of environments on *Anees* and *Dabeer*— *Anees* and *Dabeer* revolted against this. While bringing to perfection the descriptive element in *marsia*, they further widened its scope. Their beautiful description of nature sympathising with the martyrs, presented a new picture of life; their stirring narration of the deeds of bravery

performed on the plain of *Karbala* shook off the lethargy of the Indian mind ; their rousing recital of the glorious deeds of predecessors appealed to the pride of ancestry. They thus tended towards a revolution, the progress of which was hampered by those who came after them, but deserted the path they had chalked out, *Rashid* struck a compromise between *marsia* and *ghazal* by introducing the substance of the latter, through *saqinamah*, in the former.

Fusion of Cultures in *Anees*—Poets are seers ; real poetry, like true religion, creates unity in diversity. No Urdu poet has done as much as *Anees* for the fusion of Hindu and Muslim cultures. His efforts, in this direction were not obstrusive, likely to offend, but subtle and psychological. People, yes, even the most bigotted, drank in his song with avidity, realising the unity of the two apparently diverse cultures. Manners and customs are a great unifying force. *Anees* foisted upon the family of the Arabian Prophet Indian manners and customs for example :—

یارب رسولِ پاک کی کھیتی ہری رہے   صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے
اب دن ہے چھٹی کا مجھے عاشورِ محرم   تارے بھی نہ دیکھے تھے کہ ٹوٹا فلکِ غم
پوشاک نہ بدلوں گی نہ سر دھوؤں گی بابا   چلّے میں بھی جہلم کی طرح روؤں گی بابا

Fusion of Cultures in ***Naseem***—Our author has followed *Anees* in this, as in other respects. In his *marsia* on the marriage of the daughter of the Prophet, the customs described imperceptibly work at the fusion of the two cultures, and yet they are strictly in accord with the dictates of the *Quran* and the *Hadis*. Mark the effect of the following lines :—

سہرا کلاہِ جود پہ حاجت روائی کا   کنگنا بندھا کلائی میں مشکل کشائی کا
رخ کی بلائیں لینے کا موقع جو پا گئیں   حوریں ادب سے نیگ جھگڑنے کو آ گئیں

Some of the allusions and similes of our author are typically Indian, *e. g.*

تیغوں سے بھی نہ عزم میں تیرے پڑا خلل   طوفاں میں جیسے بحر کے سینے پہ ہو کنول
شعلے حسد و بغض کے گلخن سے زیادہ   ظلم و ستم و جور میں راون سے زیادہ

Freedom in ***Anees*** **and** ***Naseem***—*Anees* was smarting under the slavery of the alien and loved freedom ; he was against Imperialism and barbarism. He puts his sentiments in the mouth of *Hur*, an officer in *Yazid's* army, in his *marsias* ; his *marsia* " بخدا فارسِ میدانِ تہور تھا حُر. " and other *marsias* are full of such sentiments. *Hur* addresses the Chief Commander of *Yazid's* army.

دولتِ حاکمِ دوں پر ہے ترا دار و مدار   دارِ دنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیندار
کیا مجھے دیگا ترا حاکمِ ملعون و خسیس   کچھ تردد نہیں لکھ دے جو کوئی پرچہ نویس
ہاں سوے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں   نے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

Our author, too, has expressed similar sentiments. For example :—

نوجوں کا مجھکو خوف نہ پروائے سلطنت　　حر ہے مرا خطاب مرا دین حریت
تو چیز کیا ہے اور ترا میر شام کیا　　میں حق پرست ہوں مجھے باطل سے کام کیا

Anees has not confused *Hur's* conception of Freedom with anarchy. It was a revolt against tyranny. We fined *Hur* a most disciplined soldier of the *Imam e. g.*

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر　　دوڑ کر چوم لیے پائے شہِ عرش سریر
ہوں سرافراز جو اتنا ہی کرم ہو جائے　　نام قنبر کے غلاموں میں رقم ہو جائے

Our author, too, lays great emphasis on discipline. *Hur* addresses his brother and son when they are ready to fight against the Commander in-Chief :—

حر نے کہا کہ آؤ نہ رد و بدل کرو　　کج فہم ہیں شقی نہ ابھی ان سے بل کرو
بے مرضیِ امام نہ جنگ وجدل کرو　　جو دین کا اصول ہے اس پر عمل کرو
پہلا تو فرض یہ ہے کہ دل شہ کا صاف ہو
تیروں سے چھان دیں گے خطا تو معاف ہو

Revolutionary Pects—Time flowed on; India's problems went on getting confused and confusing. The movement for the harmonious blending of *Dharma* and *Islam*—both words practically mean the same thing—the weaving of the cultures of Arabia and India into a beautiful pattern, started by great kings like *Akbar* and numerous saints and sufis like *Nanak* and *Kabir*, was checked by

the onrush of the white alien. The exploitation of the resources of the country by the foreigner for his own benefit denuded the people of their wealth, nay, of the very means of their livelihood. The dying embers of narrow communalism and bigotted sectarianism were fanned into flame. This state of affairs lasted for some time without apparently having any effect on our literature. At last the time came, soon after the last European War, when blasted hopes, broken promises, the massacre of the innocent, forced the people into a silent revolt. A nation's literature is not only its life blood, but also the mirror of its thoughts and sentiments. As the harbinger of a bright future there arose a school of "revolutionary" poets whose ephemeral effusions appeal for a time, to an oppressed people; as conditions change for the better—as they must—they will be consigned to oblivion. But there are some—may be few, very few—who will live and continue to inspire for ever. The present author is one of them.

Present author's ;achievement—Even in the "revolutionary" school of *marsia* writers, he has introduced a revolution. It is for the first time that our author raises in his *marsia Imam Husain* from the position of a respected leader of the Mohammadans alone he had so far occupied in

the *marsia* to that of a martyr for the redemption of suffering humanity in a manner which can not fail to appeal even to non-Muslims, without giving them any offence (see *bund* No. 1, 2 and 3). It is not a mean achievement. But this is not all. Present day problems—social, economic and political—are a veritable King Charles' head; no form of present day literature can avoid them. Poetasters may well harp upon them but being ephemeral, these topics are certainly out of bounds for a true poet. Our outhor has elevated them to the plane of poetry, where they and their solution his prolific mind suggests, acquire a perennial value (see *bund* No. 21 to 28 and 49 to 66). In the hands of some well known English poets insignificant objects are endowed with life and speak in the language of the spirit. In the *marsia* that follows, these dry-as-dust matters speak the same language (see *bund* No. 50, 52 and 53).

Hali and *Naseem*—Another Urdu poem which deals with social, political and economic problems is *Musaddas-e-Hali*. It is sectarian and too didactic and dry to be effective. One has only to read this *marsia* (itself, a *Musaddas*) to find out how effective it is (see *bund* 21 to 40 and 49 to 66).

Other features of this *Marsia*—The success of a *marsia* is measured by the quantity of tears it

draws forth from the listeners. Mustard gas may do the same, but it kills. The *Marsia* that follows purges the heart through the eyes and raises noble sentiments; it infuses life and exhorts one to acts of bravery and sacrifice (see *bund* No. 75 to 84). Like the *marsia of Aness* it combines historical accuracy with poetic fancy (see *bund* No. 5, 6, 15,16 and 45). It goes beyond them and presents us a true picture of our moral being and exhorts us to rise above our present degraded condition (see *bund* No. 46 to 48) This appeal is universal. (see *bund* No. 61 and 62). Communal harmony is shown on unimpeachable evidence to be a religions duty. (see *bund* No. 25 to 29).

Its language —The language of the *marsia* is as simple Hindustani as was compatible with the subject and the audience before whom it was read. In some of his works and portions of this *marsia* the outhor writes a Hindustani capable of expressing the highest thought and the noblest sentiment, in which one will hardly find a difficult Arabic, Persian or Sanskrit word. (see *bund* No. 20) Figures of speech in which Indian Poetry is so rich, not unoften mar a poem, and make it look like a wonderful feat of intellectual gymnastic. But the mastery *Naseem-e-Amrohavi* has over them, reminds one of *Naseem-e-Lakhnavi*. (see *bund* No. 18)

Considerations of space deter me from dealing with this side of the *marsia* in greater details or illustrating by quotations from it, the special features to which I have referred in this introduction.

Concluding remarks—I should not stand any more between the reader and the *marsia.* Let him read it and from his own judgment of it and I am sure, he will find the picture I have drawn of it does not do full justice to it. Well, I'll be fully repaid, if I am thus condemned.

Lucknow,
The 4th August 1942.

یادگارِ حسین، نوا زندہ.....

سازِ حرّیت

شہید ہو کہ جو کردار تعلی ہے حسین
نشانِ عظمتِ حق مثلِ مصطفیٰ '' ''
شریکِ محبتِ قرآنِ کبریا '' ''
مسلم صدائے محبتِ بندۂ خدا '' ''
عمل سے جس نے لیا امتحاں کی کبریائی '' ''
سرِ بریدہ سے سر کر لیا خدائی
عمل حسین ہے زندگی حسین ہے
دلوں اور دلوں کی خوشی '' '' ''
عروجِ مرتبہ زندگی '' '' ''
کہ آدمی خدا آدمی
بغیر حبِ رسالت کے دشمنِ حسین نہیں
حسین سب کے ہی '' ''

حسین پیکرِ انسانیت کی جاں تو ہے
زمینِ صبر و تحمل کا آسماں تو ہے
نہ صرف دینِ محمد کی عزّ و شاں تو ہے
رہِ حیات میں سالارِ کارواں تو ہے
جہاں کو خوابِ فنا سے جگا دیا تو نے
بقا کے واسطے مرنا سکھا دیا تو نے

زہے یہ جذبۂ ہمت یہ ذوق بیداری
نہ ہونے دی بشریت کی ذلت و خواری
چلا جو رن کو سجا کر سلاح خودداری
سپاہ شام کی تیغوں کو کر دیا عاری
جتا دیا کہ اجل حریت کا زیور ہے
دکھا دیا کہ غلامی سے موت بہتر ہے

بیاں ہوں کیا ترے اوصاف اے سخن کے دھنی
بڑھی دفاع کی حد سے نہ جس کی تیغ زنی
اسیر فاقہ کشی و قانع و صبور و غنی
مرقع حسنات پیمبر مدنی
خودی سے دور خدا سے قریب تھا واللہ
غریب تھا یہ عجیب و غریب تھا واللہ

بقا کو ظلم کے طوفاں میں تو فنا سمجھا
فنا کو جادۂ انصاف میں بقا سمجھا
تمدن اور تعاون کا مدعا سمجھا
کہ اپنے درد کو سب خلق کی دوا سمجھا
دیا تھا علم کا آدم نے گو سبق پہلا
مگر کتاب عمل کا ہے تو ورق پہلا

حیات وہ کہ نہ تھا خوف مرگ دامنگیر
وفات وہ دم عیسیٰ کی جس میں تھی تاثیر
صفات وہ بشریت کی جن سے ہو تعمیر
ثبات وہ کہ مصائب کو کر لیا تسخیر
لیے تھا توسن ہمت کی باگ پنجے میں
اجل کو داب لیا صبر کے شکنجے میں

ہزار غم میں بھی حالت کبھی تباہ نہ کی
وفا کی چاہ میں اولاد کی بھی چاہ نہ کی
بچھڑ گیا پسر نوجواں پہ آہ نہ کی
پلٹ کے لاش پہ حسرت بھری نگاہ نہ کی
نہ غم کیا نہ بکا کی نہ اضطراب کیا
حسین! تو نے تو فطرت میں انقلاب کیا

کسی بلا میں بھی ہمت نہ تو نے جب ہاری
دلوں میں کر گئی گھر تیری یہ جگرداری
نہ کی جو تو نے مصائب میں گریۂ و زاری
شریک غم میں ترے خلق ہو گئی ساری
شمول سب کا تری تازہ یادگار میں ہے
شریک سبزۂ بیگانہ بھی بہار میں ہے

تجھی سے ہے بشریت کی زیب و زین حسین
تو ہی تو ہے دل انسانیت کا چین حسین
ہمیں ہے تیری ولا جن کا فرض عین حسین
زباں پہ ان کی محرم میں ہے حسین حسین
زمانہ سمجھا ہے کچھ کچھ پیام کو تیرے
ابھی تو اور ابھرنا ہے نام کو تیرے

حسین تیرے ہی دم سے قیام ہستی ہے
شباب و شیب ترا صبح و شام ہستی ہے
حسین تیری شہادت پیام ہستی ہے
وہ نیستی ہے یہی جو دوام ہستی ہے
تری بقا کے ہیں دن بیشمار۔ بیحد سال
کہ جس کی ایک گھڑی ہیں یہ سیزدہ صد سال

حسین پائے ہیں تو نے علی کے سب انداز
حسین تجھ میں ہے سب سیرت رسول حجاز
حسین تو ہے خدا کا وہ عاشق جانباز
قضا نہ ہونے دی جس نے دم قضا بھی نماز
وہ تھی نماز کہ خالق سے ناز کی باتیں
وہ بے نیاز سے راز و نیاز کی باتیں

قلم ہوا دم سجدہ جو فرق نورانی
یہی ہے نقطۂ اوج کمال انسانی
عدو بھی کہتے ہیں سن سن کے شان قربانی
حسین تو ہے بشر کا شعور روحانی
علی کا فخر ہے تو شاہ انبیا کی قسم
نہیں نبی میں یہ مظلومیت خدا کی قسم

ہے یادگار جو تیرے جہاد کا احوال
وہ حرب و ضرب نہ تھی بر بنائے غیظ و جلال
جہاں کو بلکہ جتانا یہ تھا دکھا کے کمال
علی کی ہم میں ہے طاقت رسول کا اجلال
کسی کے خوف سے کب دل پہ جبر کرتے ہیں
یہ شان رحم و کرم ہے کہ صبر کرتے ہیں

کبھی تھا صبر سے تیرے عدو کا دل بیکل
کبھی جبیں کی شکن سے تھی فوج میں ہلچل
مدبروں میں سیاست تری ہے ضرب مثل
کہ نرم و گرم تھے تیور بمقتضائے محل
وہ پند و وعظ رسول قدیر کی صورت
وہ حرب و ضرب جناب امیر کی صورت

تو ہی ہے ظلم کے پنجے کو موڑنے والا
یزیدیت کا سرِ نحس توڑنے والا
درندگانِ بلا کو جھنجھوڑنے والا
مصیبتوں کی کلائی مروڑنے والا

پہاڑ سے بھی ثبات قدم زیادہ تھا
دلِ حسین تھا اللہ کا ارادہ تھا

وہ دور جس میں کہ فاسق بنا ہوا تھا امام
نہ حق کا دین تھا سالم نہ ملت اسلام
محرمات تھے جائز امور خیر حرام
عبادتوں کو نمازی بھی کر چکے تھے سلام

جو شے حجاب کی تھی بے حجاب جائز تھی
لہو حلال ہوا تھا شراب جائز تھی

وہ بدعتیں تھیں روا دین میں معاذ اللہ
کہ تذکرے سے بھی جن کے حیا کو ہے اکراہ
نہ تھے رسول نہ اس دم صحابۂ ذیجاہ
بس ایک دم تھا ترا اے علی کے نورِ نگاہ

ابھر رہا تھا جو فتنہ، دبا دیا تو نے
شہید ہو کے عدو کو مٹا دیا تو نے

کیا وہ کام کہ پایا لقب حسین شہید
خطاب تیرے عدو کا ہوا یزید پلید
حسین طالب نصرت ہے آج پھر توحید
کہ اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں لاکھ یزید

نہیں جو فرق حرام و حلال میں باقی
عجب کی جا ہے کہ ماضی ہے حال میں باقی

مطلعِ ثالث

خزاں کا دور ہوا گلشن شریعت میں
دخیل ہو گئے باغی ریاض امت میں
نکالتے ہیں جو شاخیں اصول ملت میں
روا ہے کب یہ روش باغباں کی غیبت میں

چمن چمن جو یہ گلچیں ہیں بار پائے ہوئے
کلی کلی ہے شگوفوں سے خار کھائے ہوئے

عجیب تر ہے یہ انداز گلشن ایماں
وہی اصول کے پودے فروع کی کلیاں
وہی حدیث وہی آیتیں وہی قرآں
مگر فضا ہے نہ وہ جانفزا اب وہ سماں

اگر کھلا بھی ہے گلشن تو خوشگوار نہیں
بہار میں بھی ہمارے لئے بہار نہیں

یہ داستان الم خاص و عام کی سُنیے
نظر سے دیکھی ہوئی صبح و شام کی سُنیے
نہ داد دیجے چاہے کلام کی سُنیے
یہ شاعری نہیں باتیں ہیں کام کی سُنیے

نہ ذکر گل نہ بیان چرخ کی دو رنگی کا
یہ مرثیہ ہے دلیروں کی خانہ جنگی کا

کہیں تو نام سے جھنڈے کے جنگ ہے جاری
کہیں ہے باعثِ تفریق تعزیہ داری
ہوئی جو مدح صحابہ سے اِن کو بیزاری
تو اُن کے دل میں تبرا کا زخم ہے کاری

کبھی نماز کے انداز پر جھگڑ بیٹھے
کبھی اذان پہ ڈنکے کی چوٹ لڑ بیٹھے

یہ سورما جو یگانوں کا خون بہاتے ہیں
ہے جائے شرم کہ غیروں کی مار کھاتے ہیں
جری ہیں ایسے جو کمزور کو دباتے ہیں
مقابلہ ہو قوی سے تو سر جھکاتے ہیں

یہ ترک ہیں نہ عجم خان ہیں نہ تازی ہیں
دم فرار ہیں آگے یہ ایسے غازی ہیں

عبادتوں میں بھی ان کے عجیب ہیں انداز
زباں پہ حمد تو دل میں خیال نغمہ وساز
کبھی بجایا جو باجا کسی نے وقتِ نماز
بپھر کے توڑ دی نیت بگڑ گئے جانباز

تلے جہاد پہ حمد و ثنا کو بھول گئے
خودی تو دیکھو نمازی خدا کو بھول گئے

شاد ہے یہ وہ خلقِ حسن کا سرمایا
کہ جس سے دینِ خدا کو نبی نے چمکایا
اسی صفت کا ہے خالق نے وصف فرمایا
اسی کی مدح میں "خُلقِ عظیم" ہے آیا

اسی سے ملتِ احمد کی شان باقی ہے
خدا کی شان، نبی کا نشان باقی ہے

اسی کی وجہ سے زندہ ہے ملتِ اسلام
پیے ہوئے تھے علی ولی اسی کا جام
اسی کے دم سے زمانے میں ہے حسن کا نام
اسی سے تھا تہِ خنجر حسین کو آرام

فراتِ دہر کا پانی سبھی کو پینے دو
یہی ہے رازِ بقا دوسرے دل کو بھی جینے دو

نماز و روزہ و حج و زکواۃ و خمس و جہاد
تمہیں جو رہ گئے لے دے کے چند فریضے یاد
غضب کی جا ہے کہ بھولے نبی کا یہ ارشاد
کہ ہے عبادت حق لبعد پہلے حق عباد
ہر ایک طاعت خالق کی ہے قضا ممکن
یہ فرض ہو جو قضا پھر ادا ہے ناممکن

خدائے عز وجل گو کہ ہے رحیم و غفور
جو لاکھ جرم بھی ہونگے تو بخش دے گا ضرور
مگر گیا ہے اگر بندگان حق کا قصور
تو پھر ہے اس کی عدالت سے رحم کوسوں دور
نجات ایسے گناہوں سے زینہار نہیں
قسم خدا کی خدا کو بھی اختیار نہیں

حقوق ناس ہیں جو ہیں اس قدر عظیم الشاں
بنے کتاب مفصل کریں جو ان کا بیاں
یہ مختصر ہے کہ مشتق ہے انس سے انساں
ہر اک سے انس جو رکھو نبو انیس زماں
جو یوں رہو تو شرافت کی شان رہتی ہے
کہ جیسے دانتوں کے اندر زبان رہتی ہے

جیو نبی کی طرح تم کو ہے اگر جینا
یہ خلق تھا کہ عدو سے بھی صاف تھا سینا
نہ اپنے سے تھی عداوت نہ غیر سے کینا
جو آیا جان کے لینے کو اس کا دل چھینا

ہر اک سے یوں متواضع سدا حضور رہے
انھیں بھی پاس بٹھایا جو حق سے دور رہے

یتیم و بیوہ و محتاج و مفلس و نادار
سبھی کے واسطے دربار فیض تھا دُر بار
جو آئے اہل کدورت کبھی پئے تکرار
بچھا کے اپنی عبا دھو دیا دلوں کا غبار

یہ خُلق دیکھ کے خالق کا دین بڑھنے لگا
جہاں نے کلمہ پڑھا۔ حق درود پڑھنے لگا

زہے خصائل اصحاب پاک عرش وقار
وہ رحم و جود و عطا وہ تواضع و ایثار
دم جہاد بھی ان غازیوں کا تھا یہ شعار
ہوا عدو بھی جو سائل تو بخش دی تلوار

نہ خاص تھا کسی بندے سے فیض عام ان کا
جبھی تو دست خدا خلق میں ہے نام ان کا

وہ جب نہیں تھے تو ہستی کی کون ہستی تھی
ترقیوں کی یہ بستی عدم میں بستی تھی
گراں تھی حق طلبی جنس کفر سستی تھی
خدا کے گھر میں بھی واللہ بت پرستی تھی

جو با خدا ہے نہ کیوں ان کو نا خدا سمجھے
بھٹک کے بھی بندے جنھیں خدا سمجھے

ولی تھے ایسے کہ مدحت میں اِنّما آیا
جری تھے ایسے کہ لا سیف و لا فتیٰ آیا
کبھی جمال کی حسرت میں والضحیٰ آیا
کبھی عطا کی تمنا میں ہل اتیٰ آیا

نہ اہل دل کہیں ایسے نہ تھے جری ایسے
خدا کے نام پہ سر دے دیے سخی ایسے

ہوئے تھے خلق جو وہ با خدا عطا کے لئے
عطا بھی ان کی ہر اک بندۂ خدا کے لئے
جسے دوا نہ ملی درد لا دوا کے لئے
ملے مراد کے موتی جب ان سے جا کے لیے

ہوا کلی کا جو خواہاں اسے بہار ملی
جو ایک نان کا طالب ہوا قطار ملی

جو خضر راہ تھے اُن کی وہ تھی رواداری
جو پیرو وں ہیں ہیں اُن کے یہ ان کی خونخواری
قدم قدم پہ ہے جنگ و جدل کی تیاری
غضب ہے بھائی سے کرتا ہے بھائی غداری
بچھڑ بچھڑ کے جو آپس میں جنگ کرتے ہیں
مخالفوں کو جلاتے ہیں آپ مرتے ہیں

جو دین حق کے معاون ہیں وہ رہیں دلشاد
جو اتحاد کے دشمن ہیں جلد ہوں برباد
بھلا یہ سمجھیں گے کیونکر محل صلح و جہاد
سیاست علوی کا سبق نہیں جب یاد
مٹا رہے ہیں یہ ملت کو جنگ کر کر کے
علی نے جس کی بچائی تھی جان مر مر کے

کہے یہ کون، عدو گھات میں ہیں نادانو
یہ جنگ چھوڑ دو آپس کی اب، کہا مانو
لڑا رہے ہیں جو موذی تم ان کو پہچانو
ان آستین کے سانپوں کو دوست کیوں جانو
ارے جنھوں نے تمھیں بے چھری حلال کیا
اُنہی کے دم میں تم اب آ گئے۔ کمال کیا

بھرا ہے درسِ اُخوّت سے خود کلام مجید
عمل سے کر گئے اصحاب و آل بھی تائید
جواب دو کہ پھر آپس میں کیوں ہے جنگ شدید
ہوئی جو تم میں دوئی پھوٹ گئی توحید
لڑو فروع پہ ناحق نہ مصطفےٰ کے لئے
اصول دیں کی حفاظت کرو خدا کے لئے

پھرے ہیں حق سے جو کچھ دینِ پاک کے بدخواہ
لڑاتے رہتے ہیں امت کو یہ معاذ اللہ
بحسبِ مصلحت خود۔ بحرص دولت و جاہ
بنے ہیں سنگِ رہ اتحاد یہ گمراہ
فساد سے جہلا میں جو نام پاتے ہیں
شگوفہ چھوڑ کے پھولے نہیں سماتے ہیں

فریب دے کے ریاکار کام لیتے ہیں
حلال کرتے ہیں مالِ حرام لیتے ہیں
کبھی جو خدمت قومی کا نام لیتے ہیں
شکار حرص و ہوس ہیں کہ دام لیتے ہیں
جناں کی چاہ نہ حاجت سقر سے ڈرنے کی
انھیں تو فکر ہے دوزخ کو اپنے بھرنے کی

سروں میں گو کہ ہے تعمیر قوم کا سودا
مگر بڑھاتے ہیں جھگڑے بجائے جوش ولا
ہوئی انہی کے کرم سے یہ کشمکش پیدا
عمومیت میں غم شہ کی جس سے فرق پڑا
نبی کے لاڈلے محسن جو دین رب کے ہیں
نہیں کسی کے وہ مخصوص بلکہ سب کے ہیں

کسی گروہ سے کب خاص ہے عزائے حسین
نظر میں سب کی ہیں وہ برگزیدۂ ثقلین
سوار دوش نبی کیا نہ تھے بزینت و زین
علی کے ماہ لقا۔ فاطمہ کے نور العین
رسول کہتے تھے۔ میں خوش انہی کے چین سے ہوں
حسین مجھ سے ہے میرا تو میں حسین سے ہوں

کہا حسین کو جب مصطفےٰ نے اپنی جاں
تو پھر حضور ہی اسلام کی ہیں روح رواں
اٹھا تھا کفر کا جب ملک شام سے طوفاں
انہی نے بڑھ کے سنبھالی تھی کشتی ایماں
ہوئے شہید جو امت پہ گھر فدا کر کے
نبی کا دین بچایا خدا خدا کر کے

ہزار ظلم سہے منہ سے اف نہ کی اک بار
کہ تھے مجسمۂ خلق احمد مختار
وفا میں فرد، سراپا مروت و ایثار
خدا کے عاشق جانباز، صادق الاقرار
مصیبتوں سے نہ دب کر رہے نہ ڈر کے رہے
زبان پاک سے جو کہہ دیا وہ کر کے رہے

یہی شرف نہیں خالی کہ تھے نبی کے لال
عمل سے ان کے ہے راسخ دلوں میں جاہ و جلال
اگرچہ گزرے شہادت کو سیزدہ صد سال
مگر قلوب میں بیٹھا ہے سکۂ اقبال
نہیں وہ آج مگر ان کا کام زندہ ہے
جب ان کا کام ہے زندہ تو نام زندہ ہے

جب ان کے غم میں ہو مصروف آہ و زاری میں
تو اُن کی شان بھی دکھلاؤ غمگساری میں
مقابلے کی ہوس ہو جو بیقراری میں
حریف حُر کے بنو شوق جاں نثاری میں
غضب ہے تم رہِ علم و عمل سے بھاگے ہو
حسین کا تو سپاہی وہ ہے جو آگے ہو

بپا جو کرتے ہو مجلس شہ ہدا کے لیے
اشاعتِ غم مظلوم کربلا کے لیے
نہ یہ بکا کے لیے ہے نہ واہ وا کے لیے
یہ مدرسہ ہے فقط دین مصطفٰے کے لیے

نہیں یہ بزم ہدایت کا باب ہے گویا
حسین علم و عمل کی کتاب ہے گویا

زباں سے کرتے ہو دعویٰ حسینیت کا اگر
دکھاؤ کچھ تو حسین شہید کے جوہر
سجو وہ اسلحہ جن پر فدا ہو فتح و ظفر
ثباتِ عزم کی تلوار تو حیا کی سپر

جو حیدری ہو تو ہمت کرو دلیر بنو
بڑھو۔ نہ بڑھ کے ہٹو۔ بڑھتے جاؤ۔ شیر بنو

گھٹا رہے ہو جو آپس کی جنگ میں طاقت
یہ کسب رزق میں گر خرچ ہو، ہٹے نکبت
اجڑ چکی ہے تمھاری جو قوم کی دولت
اسی لیے تو پسی جاتی ہے اقلیت

نہیں جو زر تو کبھی اوج پا نہیں سکتے
بغیر نقد کے سکہ جما نہیں سکتے

کتاب رب میں بھی آیا ہے مال کا مذکور
یہ ہے حیات کی زینت بقول رب غفور
گدا کی حمد ہے اکثر درِ قبول سے دور
کہ لب وظیفہ میں سرگرم دل میان تنور
رجوعِ قلب کہاں، نان کے تخیل میں
زباں ہے حمد میں مصروف انتشار یاں قلب میں

جو علم دیکھو تو ہم میں ہر اک ہے فرزانہ
عمل جو دیکھو تو ہے ذی خرد بھی دیوانہ
یہ ابتری ہے کہ گھر میں نہیں اب اک دانہ
پھر اس پہ لطف یہ ہے خصلتیں ہیں شاہانہ
رہی نہ قوت احساس خوش مذاقوں میں
پکارتے ہیں خیالی پلاؤ فاقوں میں

وہ ذی خرد جو دکھاتے تھے راہ آزادی
خلاف عقل ہوئے ہیں رسوم کے عادی
دماغ ہوتا ہے مختل بموقع شادی
کہ گھر لٹاتے ہیں بر وقت خانہ آبادی
ادا جو کفر کی رسمیں تمام کرتے ہیں
خدا کے حکم میں شامل حرام کرتے ہیں

اگر پسر کی ہے شادی بفضل ربانی
حنیا فتوں میں یہ کرتے ہیں اپنی قربانی
خوشی کے جوش میں ہوتی ہے ایسی مہمانی
کہ جس کے بعد نہ کنبے کو مل سکے پانی

تباہ ہو کے بھی برباد کن عمل نہ گئے
اگرچہ جل گئی رسی مگر وہ بل نہ گئے

بوقت شادی دختر ہے بخت کا رونا
کہ فکر زیور و زر میں حرام ہے سونا
جہیز دو مگر اتنا۔ پڑے نہ گھر کھونا
کہاں کی عقل ہے خود تخم مفلسی بونا

یہ نقد و جنس جو بھر نمود دیتے ہو
مہاجنوں کو ہزاروں کا سود دیتے ہو

مقام غور ہے اے امت حبیب خدا
جہیز بنت رسول حجاز تھا کتنا
پیالہ جوشن و مشکیزہ آسیا ڈردا
یہ پانچ چیزیں تھیں اور ایک دولت عقبیٰ

نہ مال و زر تھا نہ سامان زیب و زینت کا
حیا کا پہنے تھیں زیور، لباس عصمت کا

ہم ان کے شیوۂ صبر و رضا کو بھول گئے
رسوم بد میں پھنسے ارتقا کو بھول گئے
قدیم وضع کے بندے خدا کو بھول گئے
جدید رنگ کے شیدا حیا کو بھول گئے
برائے نام جو وہ روز و شب نماز میں ہیں
یہ بیحجاب ہمیشہ سرود و ساز میں ہیں

پڑھا جو علم زباں بد زبانیاں سیکھیں
بنے ادیب جو فرضی کہانیاں سیکھیں
بقصد شعر جو رنگیں بیانیاں سیکھیں
ہوئے کلیم زماں، لن ترانیاں سیکھیں
بتوں کی مدح و ثنا بیحجاب کرنے لگے
زمین شعر کی مٹی خراب کرنے لگے

کہے وہ شعر مٹی جن سے شان خودداری
رواج پا گئے افعال ذلت و خواری
وہ بزم یار وہ غیروں کی گرم بازاری
وہ بلبلوں کا تڑپنا وہ گریۂ وزاری
گلی میں اس کی ہوں رسوا یہ کام ہے اپنا
یہی غزل ہے تو اس سے سلام ہے اپنا

یہ گیت دورمیں شاہی کے گائے جاتے تھے
کہ حرّیت کے اثر جب مٹائے جاتے تھے
سرور و عیش کے جلسے سجائے جاتے تھے
پلا پلا کے یہ جذبے دبائے جاتے تھے

نہ اُس نشاط کی حاجت نہ اُس ترانے کی
ضرورت اب تو ہے جانبازیاں دکھانے کی

وہ خوش مذاق سلف میں جو تھے فدائے غزل
کچھ اور کہنے کے خواہاں تھے خود بجائے غزل
جبھی تو کہتا ہے غالبؔ جو تھا خدائے غزل
"بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل"

وہ مبتلائے قفس کچھ جو پیش و پس نہ چلا
تڑپ کے قید میں بے بس رہ گیا کہ بس نہ چلا

سناؤ شعر اب ایسے کہ روح ہو بیدار
خبر ہے کچھ کہ زمانہ ہے بر سرِ پیکار
رہ بقا میں تقابل کا گرم ہے بازار
وہ طبلِ جنگ بجا۔ ہاں سپاہیو ہشیار

ہوائے تند کا جھونکا بصد شتاب آیا
اٹھو اٹھو کہ لبِ بام آفتاب آیا

انھیں جلاؤ جو فاقوں کے غم سے مرتے ہیں
عجب بلائیں غریبوں کے دن گزرتے ہیں
نہ محنتوں سے نہ مزدوریوں سے ڈرتے ہیں
یہ بھائی بندوں کے طعنوں کا خوف کرتے ہیں
بڑھے چلو جو انھیں راہ سے لگائے ہوئے
نہ پھر رہینگے کہ ضیغم ہیں چوٹ کھائے ہوئے

یہ ننگ و عار ہے کیوں کاروبار سے بیکار
اُسے حقیر نہ سمجھو جو تھا سلف کا شعار
زرہ بناتے تھے داؤد، نوح تھے نجار
گواہ اس کا ہے کعبہ خلیل تھے معمار
جفاکشی ہی سے موسیٰ نے برتری پائی
چرانے آئے تھے بھیڑیں پیمبری پائی

غلام تھے نہ کسی کے وہ خلق کے ہادی
رگوں میں خون کے بدلے بھری تھی آزادی
رعونتوں سے بری انکسار کے عادی
لباس فقر میں شاہوں کی شان دکھلا دی
نہ مسندوں پہ نہ تکیوں پہ محو خواب ہوئے
زمیں پہ سو گئے پڑ کر ابو تراب ہوئے

وہ دیکھو چشم تصور ذرا جھکائے ہوئے
کھڑے ہیں کون پسینے میں یہ نہائے ہوئے
یہ ہیں بغل میں نبی بیلچہ دبائے ہوئے
وہ بوتراب ہیں مٹی کا بوجھ اٹھائے ہوئے
کما رہے ہیں وہ محنت سے شام کی روزی
کہ جن کے ہاتھ میں ہے خاص و عام کی روزی

سنو تو گردش دوراں یہ کیا سناتی ہے
یہ کس کے گھر سے صدا آسیا کی آتی ہے
یہ کون صاحب عصمت کڑہی اٹھاتی ہے
جو چکی پیس کے شوہر کا غم بٹاتی ہے
نہیں ہے یہ کسی ادنیٰ فقیر کی بی بی
یہ فاطمہ ہے جناب امیر کی بی بی

لگے ہیں کام میں اپنے سبھی امیر و کبیر
غضب ہے ان کی یہ غفلت جو ہیں فقیر و حقیر
یہ اب بھی ہوش میں آئیں تو جاگ اٹھے تقدیر
جو بات بگڑی تو پھر بن نہ آئے گی تدبیر
بہا جو نہر سے پھر کر نہ پھر وہ آب آیا
"کبھی سنا ہے کہ پیری گئی شباب آیا"

نمود حشر ہے یارب نبی کی امت میں
ابھر رہے ہیں مرض چارہ گر کی صورت میں
جواب بھی رحم نہ کھائے گا تو مصیبت میں
تو پھر امام کو بھیجے گا کیا قیامت میں

یہ انتظار نہ ٹھہرا کوئی بلا ٹھہری
"کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

ملول ہیں تری فرقت میں رندہاں ساقی
نہ اپنے بادہ کشوں سے ہو بدگماں ساقی
کرینگے شوق سے تجھ پر نثار جاں ساقی
یقیں نہ ہو تو ابھی کر لے امتحاں ساقی

نہ دل ہے سرد نہ جذبات پست ہیں ساقی
یہ کیف کم ہے کہ بے دیکھے مست ہیں ساقی؟

حجاب غیب جو رخ سے اٹھائے گا ساقی
بسانِ مے رگ و پے میں سمائے گا ساقی
جو زندگی میں ہماری نہ آئے گا ساقی
میانِ حشر کہاں بچ کے جائے گا ساقی

نہ جانے دینگے نہ جب تک حساب کر لینگے
تمام عمر کی باقی وہیں یہ بھر لینگے

جو مُردہ دل کو جِلا دے وہ مے شتاب پلا
جو غفلتوں کو جَلا دے وہ آفتاب پلا
نسیم جوش میں ہے پھول دے گلاب پلا
اگر حساب کا ڈر ہو تو بیحساب پلا
وہ کس سے خوف کرے تجھ سے جو ولا رکھے
قسیم جنت و کوثر ہے تو خدا رکھے

وہ آج چشمۂ آب بقا ہو پھر جاری
مسیح و خضر کہیں جس کو روح بیداری
ہر ایک موج میں بہہ جائیں کلفتیں ساری
ہر ایک بوند ہو غفلت کے حق میں چنگاری
وہ مے جو دین کی رگ رگ میں ہے سمائی ہوئی
نبی سے صاحب تقویٰ کی پی پلائی ہوئی

نہاں رہی جو کبھی قُل کفا کے پردے میں
چھلک دکھائی کبھی اِنّما کے پردے میں
کبھی رسول نے پی لی عبا کے پردے میں
کبھی خدا نے پلا دی بٹھا کے پردے میں
نیا وہ دور بھی تھا رنگ بھی نرالا تھا
مزہ تو یہ ہے کہ ساقی بھی ہم پیالا تھا

وہ مے پلا دے جو عمار ذیوقار نے پی
وہ مے جو بوذر و سلمان جان نثار نے پی
اویس و زید نے تمّار نامدار نے پی
اذاں کے وقت بلال وفا شعار نے پی

عجیب صاحب قسمت وہ پینے والے تھے
نبی کا دور تھا۔ آیات کے پیالے تھے

وہ مے پلا جو حبیب مالک خصال نے پی
بریر و وہب نے پی بدر خوشجمال نے پی
حر دلیر نے پی عابس و ہلال نے پی
زہیر قین نے پی عوسجہ کے لال نے پی

اسی کے جوش میں کھا کھا کے زخم جھومتے تھے
زمیں پہ گر کے بھی ساقی کے پاؤں چومتے تھے

اسی شراب کے طالب ہیں آج پھر میخوار
کہ جس پہ عون و محمد ہوئے خوشی سے نثار
رہے گا یاد یہ بچوں کا جوش یہ ایثار
قریب نہر کے پیاسے گزر گئے جرار

صغیر سن میں یہ ہمت نہ یہ وفا ہوگی
نہ رخ کیا سوئے دریا کہ ماں خفا ہوگی

پئینگے اب تو یہ میکش وہ جام بے وسواس
عطش ہیں جس سے تھے سیراب ثانی الیاس
بھڑک اٹھی تھی جو ٹھنڈی ہوائے نہر سے پیاس
وفا یہ کہتی تھی باہم کہ صبر کر عباس
وہ آج پیاسے ہیں دریا تمام ہیں جن کے
انھیں پلا کے پئینگے غلام ہیں جن کے

پلا وہ جام کہ اکبر کا جس سے تھا یہ حال
گڑا جو سینے میں نیزہ ہوئے نہ غم سے نڈھال
پر اپنے وعدے کا اتنا تھا بادفا کو خیال
کہا یہ شہ سے دم نزع بھی بحزن وملال
الم نہیں جو یہ برچھی ہزار بار چلے
مگر یہ غم ہے کہ صغرا سے شرمسار چلے

بیاں ہو کیا ترے صہبا کی ساقیا تاثیر
جوان و پیر کا کیا ذکر محو تھا بے شیر
کہاں وہ ننھی سی گردن کہاں سہ پہلو تیر
صغیر چپ رہا رونیگے گر بے پیر
دکھا دیا کہ بہادر کڑی کو جھیلتے ہیں
علی کے لاڈلے یوں ناوکوں سے کھیلتے ہیں

عجیب مے ہے یہ پروردۂ ذبیح و خلیل
اثر سے جس کے تھے محو وصال شاہ جلیل
پکارتے تھے کہ تیغو بڑھو بصد تعجیل
پیو یہ خوں بشریت کے نام کی ہے سبیل

لہو بہا کے سوا میری آبرو کردو
علی کے لال کو نانا سے سرخرو کردو

ہمارے سامنے آؤ اجل کی تصویرو
کدھر ہو ظلم کے نیزو دل حزیں چیرو
گلے سے پیاسے کے لگ جاؤ جلد شمشیرو
چلو تمھیں علی اصغر کا واسطہ تیرو

رہے گی یاد یہ شان وفا زمانے کو
شہید ہوتے ہیں دنیا کا دکھ مٹانے کو

دل حسین میں تھا جاگزیں جو شوق وصال
جراحتوں کا نہ غم تھا نہ بیکسی کا ملال
نہ توڑا سجدے کو گو کر دیا شقی نے حلال
نہ تڑپی لاش بھی اعدا نے جب کیا پامال

مگر نہ ضبط ہوا جب خیام جلنے لگے
کسی کا سر جو کھلا کروٹیں بدلنے لگے

ہماری جان ہو قربان صبر زینِ عبا
جنھوں نے آنکھ سے دیکھی یہ ماں پھوپی پہ جفا
خیام پاک میں بے اذن آگئے اعدا
جلا بتول کا گھر چھن گئی حرم کی ردا
یہ ظلم و جور ہے جائز کہاں زمانے میں
بندھی ہوئی تھی رسن بی بیوں کے شانے میں

دہائی دیتی تھی یہ بیکسی بحسرت و یاس
کہاں ہو اے جگر و جان کشتۂ الماس
کہاں ہو اے علی اکبر غیور و نیک اساس
کہاں ترائی میں سوتے ہو چین سے عباس
لرز رہی ہے زمیں اب قیامت آتی ہے
اٹھو تمھاری سکینہ طمانچے کھاتی ہے

بس اے قسیم کہ مجلس میں حشر ہے برپا
بتول روتی ہیں۔ سر پیٹتے ہیں خیرِ ورا
علی کے لب پہ ہیں نالے حسن ہیں محوِ بکا
تڑپ رہے ہیں خود اس غم میں سید الشہدا
نبی کی جان دل زہرا کے چین روتے ہیں
خدا کا عرش ہے لرزاں حسین روتے ہیں

جملہ حقوق طبع و اشاعت و اقتباس بحق مصنف محفوظ ہیں

باہتمام محمد اسمٰعیل صدیقی ادبی پریس لاٹوش روڈ لکھنؤ میں چھپا